

اشاعت کا ۹۵ واں سال
زبان و ادب، تہذیب و ثقافت کا ترجمان

ننگار

۱۰ روپے

دسمبر ۲۰۱۷ء



کرشنا سوہتی قاضی عبدالستار شافع قدوائی غضنفر مشرف عالم ذوقی نہال الدین عثمانی
انور ادیب خان محمد آصف دیپک بدکی مینا عرفان محبوب حسن عادل فرراز

محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اترپردیش



اردو کے مایہ ناز ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ پیدائش (دسمبر)



ڈپٹی نذیر احمد



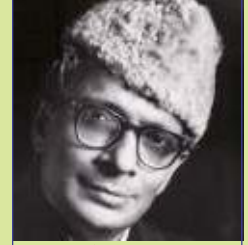
انقظار حسین



مولانا محمد علی جوہر



مولانا عبدالمجید سالک



اوپنڈر ناتھ اشٹک



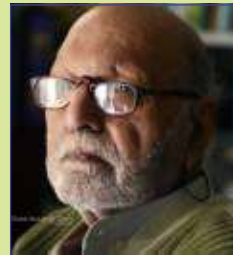
خواجہ حسن نظامی



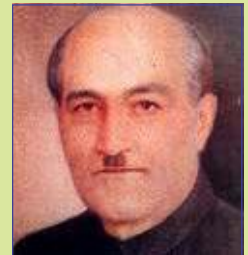
اسد اللہ خاں غالب



محمود سعیدی



انور سعید



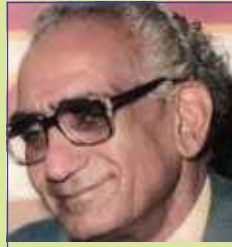
جوش ملیح آبادی



جون ایلیا



ساغر نظامی



جگن ناتھ آزاد



خلیق انجم



رشید احمد صدیقی

۱۶ اپریل ۱۹۹۳ء	۲۲ دسمبر ۱۹۰۶ء	مالک رام
۱۹۶۰ء	۲۳ دسمبر ۱۹۱۴ء	قدسیہ زیدی
۱۵ جنوری ۱۹۷۷ء	۲۳ دسمبر ۱۸۹۲ء	رشید احمد صدیقی
۲۱ مارچ ۱۹۹۰ء	۲۳ دسمبر ۱۹۲۶ء	مشیر چغتیا نوری
۳۱ جولائی ۱۹۵۵ء	۲۵ دسمبر ۱۸۷۸ء	خواجہ حسن نظامی
۳۱ مارچ ۲۰۰۲ء	۲۵ دسمبر ۱۹۱۹ء	صہبیا لکھنوی
۵ دسمبر ۱۹۹۷ء	۲۵ دسمبر ۱۹۲۵ء	خلیق احمد نظامی
۲۹ اگست ۲۰۱۳ء	۲۵ دسمبر ۱۹۳۳ء	شمس قاروقی
۱۵ فروری ۱۸۶۹ء	۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء	اسد اللہ خاں غالب
۲۲ دسمبر ۲۰۱۲ء	۲۹ دسمبر ۱۹۳۸ء	حنیف نقوی
۲ مارچ ۲۰۱۰ء	۳۱ دسمبر ۱۹۳۴ء	محمود سعیدی

۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء	۹ دسمبر ۱۸۳۷ء	محسن الملک
۳ جنوری ۱۹۳۱ء	۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ء	مولانا محمد علی جوہر
۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء	۱۲ دسمبر ۱۷۸۹ء	آزاد دہلوی
۱۹ نومبر ۱۹۵۵ء	۱۳ دسمبر ۱۸۶۶ء	برج موہن ناتھ کپٹانی
۲۷ ستمبر ۱۹۵۹ء	۱۳ دسمبر ۱۸۹۳ء	مولانا عبدالمجید سالک
۱۸ جنوری ۱۹۹۶ء	۱۳ دسمبر ۱۹۱۰ء	اوپنڈر ناتھ اشٹک
۸ نومبر ۲۰۰۲ء	۱۳ دسمبر ۱۹۱۰ء	جون ایلیا
۲۴ جولائی ۲۰۰۳ء	۱۵ دسمبر ۱۹۱۸ء	جگن ناتھ آزاد
۳ جنوری ۲۰۱۳ء	۱۶ دسمبر ۱۹۱۳ء	سالک لکھنوی
۲۱ فروری ۱۹۸۳ء	۲۱ دسمبر ۱۹۰۵ء	ساغر نظامی
۱۸ اکتوبر ۲۰۱۶ء	۲۲ دسمبر ۱۹۳۵ء	خلیق انجم

۲۰ مارچ ۲۰۱۶ء	۳ دسمبر ۱۹۲۸ء	انور سعید
۲۲ فروری ۱۹۸۲ء	۵ دسمبر ۱۸۹۸ء	جوش ملیح آبادی
۱۲ مارچ ۱۹۹۸ء	۶ دسمبر ۱۹۲۴ء	قیوم حفیظ
۳ مئی ۱۹۱۲ء	۶ دسمبر ۱۸۳۶ء	ڈپٹی نذیر احمد
۲۵ ستمبر ۱۹۶۲ء	۶ دسمبر ۱۹۰۳ء	محمد الدین قادری زور
۱۶ جولائی ۲۰۰۲ء	۷ دسمبر ۱۹۳۵ء	حمید الماس
۲ فروری ۲۰۱۶ء	۷ دسمبر ۱۹۲۳ء	انقظار حسین
۴ مارچ ۱۹۷۷ء	۸ دسمبر ۱۹۲۵ء	ناصر کاشفی
۲۰ جنوری ۱۹۵۹ء	۸ دسمبر ۱۸۷۵ء	سرتاج بہادر سپرو
۲۱ فروری ۱۹۸۱ء	۸ دسمبر ۱۹۰۳ء	انتیا زعلی عرشی
۷ مارچ ۲۰۱۳ء	۸ دسمبر ۱۹۳۹ء	صغریٰ مہدی

بگھریے توئی کونسل برائے فروغ اردو دہلی

نیکادور

دسمبر ۲۰۱۷ء

پبلشر: انج کمار جھما

ڈائریکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اتر پردیش

ایڈیٹر

سہیل وحید

فون: 9415007694

Ph. No. 2239132 Ext. 228

Email: nayadaurmonthly@gmail.com

معاونین

نعت عمی، شاہد کمال

برائے سرکولیشن و زرسالانہ

صبا عرفی، غفران سیم

فون: 7705800953

ترجمین کار: وقار حسین

مطبوعہ: پرکاش پبلیشرز، گولہ گنج، لکھنؤ

شائع کردہ: محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اتر پردیش

زرسالانہ: ۱۱۰ روپے

ترسیل زر کا پتہ

ڈائریکٹر

انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

Please send Cheque/Bank Draft in favour of Director, Information & Public Relations Department, UP, Lucknow

خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعہ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

اس شمارے میں...

اداریہ

اپنی بات ایڈیٹر ۲۸

سالنامہ ۲۰۱۷ء

اسموگ، ادنیٰ افق اور گم ہوتے پرندے مشرف عالم ذوقی ۲۱

مضامین

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزشتہم مفتی ابوالعراقان میاں فرنگی محلی ۱۱

عصمت آیا اور ان کے طفیل میں قاضی عبدالستار ۱۳

زبان کا ترسیلی کردار اور حروفِ تنجی شافع قدوائی ۳۲

اردو رسم خط کی چند بنیادی باتیں غضنفر ۳۴

اردو کی تدریس میں اجتہاد کی ضرورت نہال الدین عثمانی ۴۰

اردو کی ابتدا اور ارتقاء کا مختصر جائزہ انور ادیب ۴۸

بھوج پوری لوک دانش اور گلوبلائزیشن خان محمد آصف ۵۰

اردو ہندی زبانوں کا سنگم اور ہندوستانی تہذیب طاہرہ پروین ۵۲

گزشتہ لکھنؤ

لکھنؤی تمدن کا آغاز کوسب قدر سجاد علی مرزا ۶۳

افسانے

پھٹا ہوا لہم دیک بک بک ۵۵

خیال کی موت عادل فراز ۵۹

امید بینا عرفان ۶۱

ہندی کہانی

میری ماں کہاں کرشنا سوہتی ۶۷

ہندوستانی زبانیں

اینڈھن (ساتویں قسط) حمید دلوانی ۷۱

جاذبات

مرزا اسد اللہ خاں غالب ۴۴

گل افشانی

اللہ کے نام پر پڑھ لے بابا محبوب حسن ۷۹

نعت

اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی ۲

دلورام کوثری ۵

مضطر خیر آبادی ۶

محسن کاکوروی ۷

امید فاضلی ۸

پروفیسر ستنام سنگھ خمار ۹

رفیع سوسوی ۱۰

ترقیات

کسانوں کو قرض سے نجات نجیب انصاری ۸۲

تقریرات

آپ کے خطوط ۸۶

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی

نعت

شمعِ بزمِ دنی ہو میں گم گن انا
شرحِ متن ہو بیت پہ لاکھوں سلام
کثرتِ بعدِ قلت پہ اکثر دُرود
عزتِ بعدِ ذلت پہ لاکھوں سلام
ربِّ اعلیٰ کی نعمت پہ اعلیٰ دُرود
حقِ تعالیٰ کی منت پہ لاکھوں سلام
ہم غریبوں کے آقا پہ بے حد دُرود
ہم فقیروں کی ثروت پہ لاکھوں سلام
جس کے جلوے سے مرجھائی کلیاں کھلیں
اُس گلِ پاکِ مَنبت پہ لاکھوں سلام
سببِ ہر سبب منتہائے طلب
علتِ جملہ علت پہ لاکھوں سلام
مصدرِ مظہریت پہ اظہر دُرود
منظہرِ مصدریت پہ لاکھوں سلام
طائرانِ قُدس جس کی ہیں قمریاں
اُس سہی سروِ قامت پہ لاکھوں سلام
وصف جس کا ہے آئینہ حق نما
اُس خدا سازِ طلعت پہ لاکھوں سلام
جس کے آگے سرِ سرواں خمِ ریزیں
اُس سرِ تاجِ رفعت پہ لاکھوں سلام

اصل ہر بُود و بہبود ختم وجود
قاسمِ کنزِ نعمت پہ لاکھوں سلام
فتحِ بابِ نبوت پہ بے حد دُرود
ختمِ دورِ رسالت پہ لاکھوں سلام
شرقِ انوارِ قدرت پہ نوری دُرود
فتحِ آرزوِ قدرت پہ لاکھوں سلام
بے سہیم و قسیم و عدیل و مثیل
جوہرِ فردِ عزت پہ لاکھوں سلام
سِرِّ غیبِ ہدایت پہ نبی دُرود
عطرِ جیبِ نہایت پہ لاکھوں سلام
ماہِ لاہوتِ خلوت پہ لاکھوں دُرود
شاہِ ناسوتِ جلوت پہ لاکھوں سلام
کنزِ ہر بے کس و بے نوا پر دُرود
حرزِ ہر رفتہ طاقت پہ لاکھوں سلام
پر تو اسمِ ذاتِ احد پر دُرود
نسخہٴ جامعیت پہ لاکھوں سلام
مطلعِ ہر سعادت پہ اسعد دُرود
مقطعِ ہر سیادت پہ لاکھوں سلام
خلق کے دادرس سب کے فریادرس
کہفِ روزِ مصیبت پہ لاکھوں سلام

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام
مہرِ چرخِ نبوت پہ روشن دُرود
گلِ باغِ رسالت پہ لاکھوں سلام
شہریارِ ارمِ تاجدارِ حرم
نوبہارِ شفاعت پہ لاکھوں سلام
شبِ اسرا کے دولہا پہ دائم دُرود
نوشہٴ بزمِ جنت پہ لاکھوں سلام
عرش کی زیب و زینت پہ عشی دُرود
فرش کی طیب و نوزہت پہ لاکھوں سلام
نورِ عینِ لطافت پہ اطف دُرود
زیب و زینِ نظافت پہ لاکھوں سلام
نقطہٴ سِرِّ وحدت پہ کیلتا دُرود
مرکزِ دورِ کثرت پہ لاکھوں سلام
صاحبِ رجعتِ شمس و شق القمر
نامپِ دستِ قدرت پہ لاکھوں سلام
جس کے زیرِ لواءِ آدم و من سوا
اس سزائے سیادت پہ لاکھوں سلام
عرشِ تافرش ہے جس کے زیرِ نگیں
اُس کی قاہرِ ریاست پہ لاکھوں سلام

اصل نسلِ صفا وچہ وصلِ خدا
بابِ فصلِ ولایت پہ لاکھوں سلام
شیرِ شمشیرِ زنِ شاہِ خمیرِ شکن
پرتوِ دستِ قدرت پہ لاکھوں سلام
ماہیِ رض و تفضیل و نصب و خدوج
حامیِ دین و سنت پہ لاکھوں سلام
مومنینِ پیشِ فتح و پسِ فتح سب
اہلِ خیر و عدالت پہ لاکھوں سلام
جس مسلمان نے دیکھا انہیں اک نظر
اُس نظر کی بصارت پہ لاکھوں سلام
جن کے دشمن پہ لعنت ہے اللہ کی
اُن سب اہلِ محبت پہ لاکھوں سلام
باقی ساقیانِ شرابِ طہور
زینِ اہلِ عبادت پہ لاکھوں سلام
اور جتنے ہیں شہزادے اُس شاہ کے
اُن سب اہلِ مکانت پہ لاکھوں سلام
نورِ جاںِ عطرِ مجموعہ آلِ رسول
میرے آقا نے نعت پہ لاکھوں سلام
تیرے ان دوستوں کے طفیل اے خدا
بندۂ تنگِ خلقت پہ لاکھوں سلام
ایک میرا ہی رحمت میں دعویٰ نہیں
شاہ کی ساری اُمت پہ لاکھوں سلام
کاش محشر میں جب اُن کی آمد ہو اور
بھیجیں سب اُن کی شوکت پہ لاکھوں سلام
مجھ سے خدمت کے قدسی کہیں ہاں! رضا
مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

اُن کے مولا کا اُن پر کروڑوں دُرود
اُنکے اصحاب و عترت پہ لاکھوں سلام
پارہائے صُحفِ غنچہ ہائے قدس
اہلِ بیتِ نبوت پہ لاکھوں سلام
آپِ تطہیر سے جس میں پودے جے
اُس ریاضِ نجابت پہ لاکھوں سلام
خونِ خیرِ الرسل سے ہے جن کا خمیر
اُن کی بے لوثِ طینت پہ لاکھوں سلام
اُس بتولِ جگرِ پارۂ مصطفیٰ
جملہ آرائے عفت پہ لاکھوں سلام
جس کا آنچل نہ دیکھا مہ و مہر نے
اُس یدائے نزاہت پہ لاکھوں سلام
سیدہ زاہدہ طیبہ طاہرہ
جانِ احمد کی راحت پہ لاکھوں سلام
جس کی منبر ہوئی گردنِ اولیا
اُس قدم کی کرامت پہ لاکھوں سلام
اوجِ مہرِ ہدیٰ موجِ بحرِ ندی
روحِ رُوحِ سخاوت پہ لاکھوں سلام
شہدِ خوارِ لعابِ زبانِ نبی
چاشنیِ گیرِ عصمت پہ لاکھوں سلام
اُس شہیدِ بلا شاہِ گلگوںِ قبا
بے کسِ دشتِ غربت پہ لاکھوں سلام
اہلِ اسلام کی مادرانِ شفیق
بانوانِ طہارت پہ لاکھوں سلام
مرتضیٰ شیرِ حق اشجعِ الاشجعین
ساقیِ شہر و شہرت پہ لاکھوں سلام

لحنتِ لختِ دلِ ہر جگر چاک سے
شانہ کرنے کی عادت پہ لاکھوں سلام
دور و نزدیک کے سُننے والے وہ کان
کانِ لعلِ کرامت پہ لاکھوں سلام
جس کے ماتھے شفاعت کا سہرا رہا
اُس جمینِ سعادت پہ لاکھوں سلام
جن کے سجدے کو محرابِ کعبہ جھکی
اُن بھووں کی لطافت پہ لاکھوں سلام
اُن کی آنکھوں پہ وہ سایہِ اقلنِ مژہ
ظلہِ قہرِ رحمت پہ لاکھوں سلام
اشکِ باریِ مرگاں پہ برستے دُرود
سلکِ دُر شفاعت پہ لاکھوں سلام
معنیِ قَدِ رَأٰیِ مقصدِ مَطْعٰی
زرگسِ بارخِ قدرت پہ لاکھوں سلام
جس طرف اٹھ گئی دم میں دم آ گیا
اُس نگاہِ عنایت پہ لاکھوں سلام
نیچی آنکھوں کی شرم و حیا پر دُرود
اوپچی بینی کی رفعت پہ لاکھوں سلام
جن کے آگے چراغِ قمرِ جہلمائے
اُن عذاروں کی طلعت پہ لاکھوں سلام
اُن کے آگے وہ حمزہ کی جاں بازیاں
شیرِ عُرّانِ سطوت پہ لاکھوں سلام
الغرض اُن کے ہر مؤ پہ لاکھوں دُرود
اُن کی ہر رُخ و خصلت پہ لاکھوں سلام
اُن کے ہر نام و نسبت پہ نامی دُرود
اُنکے ہر وقت و حالت پہ لاکھوں سلام

میر تقی میر

نعت

سبز برپا ہوگا جب تیرا نشان
آفتاب حشر میں بہر اماں
ہووے گی انواع خلقت جمع واں
کیوں نہ ہوں سائے میں اسکے دو جہاں
رحمۃ للعالمین یا رسول
ہم شفیع المذنبین یا رسول

روسیا ہی جرم سے ہے پیشتر
روسفیدوں میں نخل مجھ کو نہ کر
ایک کیا آنکھیں مری ہی ادھر
تجھ سے راضی ہے بصر اہل نظر
رحمۃ للعالمین یا رسول
ہم شفیع المذنبین یا رسول

کچھ بھی جو ہیں واقف راز و نیاز
عام تجھ انعام پر کر چشم باز
شعر یہ مشہور سب ہو دل گداز
پڑھتے ہیں جائے دعا بعد از نماز
رحمۃ للعالمین یا رسول
ہم شفیع المذنبین یا رسول

جب تلک تاثیر کا تھا کچھ گماں
گہر قرآں خواں میر تجھے گہر سبح خواں
وقت یکساں تو نہیں اے دوستاں
اب یہی ہے ہر زمان و روزیاں
رحمۃ للعالمین یا رسول
ہم شفیع المذنبین یا رسول

دہر زیر سایہ لطف عمیم
خلق سب وابستہ خلق عظیم
تجھ سے جو یائے کرم عاصم اشیم
سخت حاجت مند ہیں ہم تو کریم
رحمۃ للعالمین یا رسول
ہم شفیع المذنبین یا رسول

ہورے ہیں ہم جو دوزخ کے حطب
سر پہ یہ اعمال لائے ہیں غضب
رکھتے ہیں چشم عنایت تجھ سے سب
تجھ سوا کس سے کہیں احوال اب
رحمۃ للعالمین یا رسول
ہم شفیع المذنبین یا رسول

نیک و بد تیرے شاخوآن بہم
لطف تیرا آرزو بخش ام
ملتفت ہو تو تو کا ہے کا ہے غم
تو رحیم و مستحق رحم ہم
رحمۃ للعالمین یا رسول
ہم شفیع المذنبین یا رسول

روؤں ہوں شرم گنہ سے زار زار
بے عنایت کچھ نہیں اسلوب کار
دل کو جب ہوتا ہے آکر اضطرار
زیر لب کہتا ہوں یہ میں بار بار
رحمۃ للعالمین یا رسول
ہم شفیع المذنبین یا رسول

جرم کی ہو شرم گینی یا رسول
اور خاطر کی حزینی یا رسول
کھینچوں ہوں نقصان دینی یا رسول
تیری رحمت ہے یقینی یا رسول
رحمۃ للعالمین یا رسول
ہم شفیع المذنبین یا رسول

لطف تیرا عام ہے کر مرحمت
ہے کرم سے تیرے چشم کرمیت
مجرم عاجز ہوں کر تک تقویت
تو ہے صاحب تجھ سے ہے یہ مسئلت
رحمۃ للعالمین یا رسول
ہم شفیع المذنبین یا رسول

کیا سیہ کاری نے منہ کالا کیا
بات کرنے کا نہیں کچھ منہ رہا
رحم کا خاک مذلت سے اٹھا
میرے عفو جرم کی تخصیص کیا
رحمۃ للعالمین یا رسول
ہم شفیع المذنبین یا رسول

اب ٹھہرتا تک نہیں پائے ثبات
دیکھیری کر کہ پاؤں میں نجات
جرم کیا ہیں میری کتنی مشکلات
بے کفایت ایک تیری التفات
رحمۃ للعالمین یا رسول
ہم شفیع المذنبین یا رسول

دلورام کوثری

نعت

مرے منہ سے منظور تھی نعت حضرت
مجھے فرد رطب اللسانی میں رکھا

ذرا نقشہ نعت کا کر نظارہ
ہے کیا نقش بہزاد و مانی میں رکھا

بہار ریاض ثنائے نبی نے
ذہن کو مرے گل فشانی میں رکھا

نبی کے ہوئے نعت گو دو برابر
کہ دونوں کو اک مدح خوانی میں رکھا

ہے حسان پہلا تو میں دوسرا ہوں
نہیں فرق اول میں ثانی میں رکھا

خدا نے اسے سوچی محفل عرب کی
مجھے بزم ہندوستانی میں رکھا

اسے سیر دکھائی دشت بیاں کی
مجھے غرق بحر معانی میں رکھا

میں کوثر سے پنجاب میں آیا یارو
مجھے حق نے پانی ہی پانی میں رکھا

لکھیں کوثری عمر بھر ہم نے نعتیں
نہ کچھ اور غم زندگانی میں رکھا

نہ کر شور اے بلبل گل فسانہ
ہے کیا تیری اس لن ترانی میں رکھا

میں ہوں نعت گو میرا رتبہ بڑا ہے
نہیں کچھ تری ہم زبانی میں رکھا

خدا نے کئے جب کہ تقسیم رتبے
تو یوں سب کو پھر قدردانی میں رکھا

کہ آدم کو نخر ملائک بنا کر
انہیں جنت جادوانی میں رکھا

بڑی عمر نوح نبی کو عطا کی
سلامت جو طوفاں سے پانی میں رکھا

دیا خضر کو چشمہ آب حیواں
براہیم کو باغبانی میں رکھا

دیا حسن بے مثل یوسف کو اس نے
سلیمان کو حکمرانی میں رکھا

دم زندگی بخش عیسیٰ کو بخشا
تو موسیٰ کو خوش لن ترانی میں رکھا

محمد کو بھیجا جو آخر خدا نے
انہیں رتبہ لا مکانی میں رکھا

مجھے نعت نے شادمانی میں رکھا
کہ مصروف شیریں زبانی میں رکھا

میں لکھتا رہا نعت اور حق نے شب بھر
قمر کو مری پاسہانی میں رکھا

نہیں اختیار اب سے کی نعت گوئی
یہی شغل ہم نے جوانی میں رکھا

در مصطفیٰ کی طے گر گدائی
تو پھر کیا ہے صاحبقرانی میں رکھا

محمد کو بے سایہ حق نے بنایا
یہ پہلا نشان نقش ثانی میں رکھا

جو ذرہ اڑا شہ کی گرد قدم کا
زمانے نے تاج کیانی میں رکھا

نہ کر آفتاب فلک اتنا غرہ
کہ تجھ کو بھی ہے دار فانی میں رکھا

در حضرت مصطفیٰ تجھ کو بخشا
تجھے منزل آسمانی میں رکھا

تو ہے در بدر گردش آسماں سے
مجھے حلقہ مہربانی میں رکھا

داعِ دہلوی

نعت

نہ ہو کیونکر افضل ہمارا محمد
 کہ ہے اپنے پیارے کا پیارا محمد
 الہی یہ محشر میں ہم کہتے جائیں
 کہاں ہے کہاں ہے ہمارا محمد
 وہیں کشتی نوح بھی ڈوب جاتی
 نہ دیتے جو اس کو سہارا محمد
 ابھی فرش سے عرش مل جائے جھک کر
 کریں گر طلب کا اشارا محمد
 یہی بات عاشق نے معشوق سے کی
 نہیں تیری فرقت گوارا محمد
 کہیں گے یہی اس شہ انبیاء سے
 وہاں ہوں گے جب آشکارا محمد
 شفیع ام روز محشر تمہیں ہو
 ہمیں ہے تمہارا سہارا محمد
 صدا خیر مقدم کی کعبے سے آئی
 حرم سے جب آئے دوبارا محمد
 بلا لو مدینے میں پھر داعِ کو تم
 نہیں بند میں اب گزارا محمد

مضطر خیر آبادی

نعت

شجر وفا کے جو پھول ہیں، بہ خدا خدا کے رسول ہیں
 جو ضیائے حسن قبول ہیں، بہ خدا خدا کے رسول ہیں
 جو علاج خاطر زار ہیں، جو دلوں کی وجہ قرار ہیں
 جو دوائے جانِ ملول ہیں، بہ خدا خدا کے رسول ہیں
 جو الم میں سب کی نجات ہیں، جو قلیق میں حامی ذات ہیں
 جو غموں میں سب کے شمول ہیں، بہ خدا خدا کے رسول ہیں
 صفت اثر جو ضرور ہیں، وہ حضور ہیں وہ حضور ہیں
 صفت دعا جو قبول ہیں، بہ خدا خدا کے رسول ہیں
 جو امین بابِ رفاہ ہیں، وہ جو بیکسوں کی پناہ ہیں
 وہ جو جد آل بتول ہیں، بہ خدا خدا کے رسول ہیں
 جو طیب خاطر پرالم، جو حکیم حسرت درد و غم
 جو دوائے رنجِ فضول ہیں، بہ خدا خدا کے رسول ہیں
 کوئی اور مضطر بے نوا، نہیں اہل دہر کا آسرا
 بہ خدا خدا کے رسول ہیں، بہ خدا خدا کے رسول ہیں

غلام مصحفی ہمدانی

نعت

حنا سے ہے یہ تری سرخ یہ نگار انگشت
کہ ہوں نہ پنجہ مرداں کی زینہار انگشت

ہلال و بدر ہوں کیجا عرق فشانی کو
رکھے جبیں پہ جو تو کر کے تابدار انگشت

بیاں ضرور ہے اب دست و تیغ کا اس کے
نکل گئی ہو سر مہ سے جس کی پار انگشت

مخو عربی معجزوں کا جس کے کبھی
نہ کر سکے فلک پیر کی شمار انگشت

چمن میں اسکی رسالت کا جب بھی آئے ہے ذکر
علم کرے ہے شہادت کی شاخسار انگشت

کرے جو وصف کو اس تاج انبیاء کے رقم
قلم کی جوں نئے نرگس ہو تاجدار انگشت

محسن کا کوروی

نعت

سب سے اعلیٰ تری سرکار ہے سب سے افضل
میرے ایمان مفصل کا یہی ہے مجمل

ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیرے خالی
نہ مرا شعر، نہ قطعہ، نہ قصیدہ نہ غزل

دین و دنیا میں کسی کا نہ سہارا ہو مجھے
صرف تیرا ہو بھروسا تری قوت ترا بل

آرزو ہے کہ ترا دھیان رہے تا دم مرگ
شکل تیری نظر آئے مجھے جب آئے اجل

روح سے میری کہیں پیار سے یوں عزرائیل
کہ مری جان، مدینہ کو جو چلتی ہے تو چل

یاد آئینہ رخسار سے حیرت ہو تجھے
گوشہ قبر نظر آئے تجھے شیش محل

میزباں بن کے نکیرین کہیں گھر ہے تیرا
نہ اٹھانا کوئی تکلیف نہ ہونا بیکل

صف محشر میں ترے ساتھ ہو تیرا مداح
ہاتھ میں ہو یہی مستانہ قصیدہ یہ غزل

کہیں جبریل اشارے سے کہ ہاں بسم اللہ
سمت کاشی سے چلا جانب مقہرا بادل

قیس زندگی پوری

نعت

وہ چلا براق پہ جس گھڑی تو زمیں کے بعد ہوا میں تھا
رہی پیچھے تھک کے ہوا ادھر، وہ ہوا سے آگے فضا میں تھا
ہوئی دم زدن میں فضا بھی طے، وہ فضا سے بڑھ کر سما میں تھا
کشش اور بڑھ گئی عشق کی وہ سما سے قرب خدا میں تھا
تو ملک پکار اٹھے کہ مصطفیٰ بَلِّغِ الْعُلَمَاءِ بِحَبَابِهِ

ہوئی عرش و فرش کی جب بنا تو زمانہ تیر و تار تھا
نہ قمر کی چاندنی کا نشان نہ پتہ تھا پرتو مہر کا
تو حجابِ راز سے دفعۃً یہی نورِ پاک چمک اٹھا
تو فضا میں شورِ درود تھا کہ جہاں کا رنگ بدل گیا
گئی تیرگی ہوئی روشنی کَشَفَ الدُّجَى بِحَبَابِهِ

یہ وہ ذات ہے جسے حق نے رکھا جلااتوں کے حجاب میں
اسی برقِ حسن کا گھر کبھی تھا تجلیوں کے سحاب میں
یہ وہ نور ہے کبھی جس کا سایہ نظر نہ آسکا خواب میں
اسے لاکھوں غوطے دئے گئے ہیں، فضیلتوں کے گلاب میں
اسے ایسا پاک بنا دیا حَسَنَتْ جَمِيعُ حَبَابِهِ

وہ نبی کا حسن و جمال تھا کہ درود بھیجتا تھا خدا
یہی شورِ صلحِ علیٰ النبی کا ملائکہ میں سدا رہا
شب و روز شام و سحر ہمیشہ وہ رحمتوں میں گھرا رہا
مگر اس کی امت خاص کا جو اداس چہرہ نظر پڑا
تو خدا نے اذن یہ دے دیا صَلُّوا عَلَيْهِ وَ آٰلِهِ

امیدِ فاضلی

نعت

ان کی مدحت کو قلم تحریر کر سکتا نہیں
حرف موجِ نور کو زنجیر کر سکتا نہیں

جس کا مسلک پیرویِ اسوۂ سرکار ہے
کوئی اس انسان کو تسخیر کر سکتا نہیں

ذہن و دل کا مرکز و محور نہ ہو جب تک وہ ذات
کوئی اپنی ذات کی تعمیر کر سکتا نہیں

لا سے الا اللہ تک گر مصطفیٰ رہبر نہ ہوں
منزلوں کا فیصلہ ربگیر کر سکتا نہیں

آپ ہی سے زندگی نے پائے ہیں ایسے چراغ
کوئی جھونکا جس کو بے تنویر کر سکتا نہیں

معرفتِ اسمِ محمد کی نہ ہو جب تک امید
آدی قرآن کی تفسیر کر سکتا نہیں

پروفیسر ستنام سنگھ خمار

نعت

حجاب دل میں نہیں چہرے پر نقاب نہیں
 شعورِ عشق محمدؐ ترا جواب نہیں
 ترا غلام ہوں اے نفس مطمئن کب سے
 مرے پیالے میں بہکی ہوئی شراب نہیں
 میں پر خطا ہوں گنہگار ہوں بہت لیکن
 مجھے یقین ہے کہ مٹی مری خراب نہیں
 سخی تو اور بھی ہیں آپ کی حکومت میں
 مگر حضور کی بخشش کا کچھ حساب نہیں
 فضیلتوں کا عمامہ پہن کے تو آیا
 کمال و علم میں تیرا کوئی جواب نہیں
 تصورات کے مرکز میرے وجود کے دل
 تو ایک نورِ حقیقت ہے لطف خواب نہیں
 وہ سنگے پاؤں ہے کیونکر چلے گا کانٹوں پر
 نبیؐ کا عشق اگر اس کا ہم رکاب نہیں
 خمار دور سے ان کا کروں گا نظارہ
 انہیں قریب سے دیکھوں نظر میں تاب نہیں

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

نعت

یہ سینہ اور یہ دل دوسرا معلوم ہوتا ہے
 کوئی پردوں میں دل کے آچھپا معلوم ہوتا ہے
 دل دیوانہ، یہ وقتِ دعا معلوم ہوتا ہے
 حریمِ ناز کا پردہ اٹھا معلوم ہوتا ہے
 مدینہ تک پہنچ جائے، پہنچ جائے تو مر جائے
 یہی بیمار غم کا مدعا معلوم ہوتا ہے
 کوئی منزل ہو، کوئی آستان ہو، کوئی محفل ہو
 وہ نورِ سردی ہی جا بجا معلوم ہوتا ہے
 وفورِ درد، احساساتِ افسردہ، بتاؤں کیا
 مجھے محسوس کیا ہوتا ہے، کیا معلوم ہوتا ہے
 رسائی شمع تک کرتا ہے پروانہ شعاعوں سے
 خدا کے نور سے یعنی خدا معلوم ہوتا ہے
 سمٹ کر دو جہاں کی وسعتیں آئیں تخیل میں
 تصور سرورِ لولاک کا معلوم ہوتا ہے
 سحر کے لب بہ افراطِ ادب بے تاب جنبش ہیں
 سفرِ صلحِ علی صلحِ علی معلوم ہوتا ہے

پورن سنگھ ہنر

نعت

ہر پھول میں ہے نکہتِ سرشارِ محمد
 اللہ رے جاں بخشئی گلزارِ محمد
 اے صلِّ علیٰ عرفیٰ بازارِ محمد
 ہر کوئی ہے دنیا میں خریدارِ محمد
 اب دولتِ کونین کی پروا نہیں مجھ کو
 حاصل ہے مجھے دولتِ دیدارِ محمد
 دنیا سے غرض اس کو نہ عقبیٰ کا طلبگار
 آزاد دو عالم ہے گرفتارِ محمد
 دیکھو تو کہاں میں ہوں کہاں طائرِ سدرہ
 مسکن ہے مرا سایہ دیوارِ محمد
 مہر و مہ و انجم ہیں ضیاءِ اسی سے
 اے صلِّ علیٰ تابشِ رخسارِ محمد
 قائلِ دل و جاں سے ہوا جاتا ہے زمانہ
 کتنی اثر انگیز ہے گفتارِ محمد
 مایوس پلٹتا نہیں در سے کوئی سائل
 زرِ باش ہے زربار ہے سرکارِ محمد
 سو عیب سہی مجھ میں مگر یہ تو ہنر ہے
 سو جاں سے ہنر میں ہوں خریدارِ محمد

رفیع سرسوی

نعت

زمیں پہ نورِ خدائے مطلق کا معجزہ سر بسر محمد
 ابد نشاں سرحدوں میں آدم سے پہلے تھے جلوہ گر محمد
 انا پرستوں کی سرکشی پر وہ بددعا میں بھی کیسے کرتے
 خدا کی جانب سے منتخب جب ہوئے تھے خیر البشر محمد
 علی کے لہجے میں ہو رہی تھیں خدا سے جس دم نبی کی باتیں
 تھا دو کمانوں کا فاصلہ بس ادھر تھا جلوہ ادھر محمد
 بصارتِ چشمِ علم و عرفاں ہی دیکھ سکتی ہے یہ حقیقت
 دو پہلو اک آئینہ ہے گویا خدا موثر اثر محمد
 زمانہ حسبِ ضرورت اپنے حصارِ صرف و نحو میں رکھتا
 اگر نہ دیتے تُم آیتوں کو پناہ زبرِ محمد
 سمجھ سکے نہ زمانے والے معنہ اب تک بنے ہوئے ہیں
 تمہارے بچوں کے یہ کھلونے نجوم و شمس و قمر محمد
 پڑی جو اسلام کو ضرورت سروں کی نکالنا کونے گھر سے
 تمہارے دیں کو بچا کے لائے تمہارے قلب و جگر محمد
 رفیع دل کے مچھلتے ارماں سے آرہی ہیں صدائیں پیہم
 کروں براقی ہوا پہ میں بھی پئے مدینہ سفر محمد



مفتی ابوالحسن علی ندوی
فرنگی محل، چوک بکھنؤ

فون: 0522-2253800

غالب شنائے خواجہ بیزدال گزاشتم

اس لئے درود شریف کی کثرت کرنا خاص طور سے مخصوص موقعوں پر عظمت و اکرام کے ساتھ محفل درود و سلام منعقد کرنا ہی فلاح دارین کا سبب ہے۔

ربیع الاول کا مہینہ جس میں کوئی فضیلت نہیں تھی صرف اس لئے فضیلت کا حامل بنا کہ اس مہینہ کی ۱۲ ویں تاریخ کو آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ ہوئی۔ اگر آپ دنیا میں تشریف نہ لاتے تو اس کائنات کا وجود نہ ہوتا۔ نہ دن ہوتے اور نہ متبرک مہینے ہوتے، اللہ تعالیٰ کی برکتوں کے خزیئے ہوتے اور نہ اسکی بے پناہ رحمتوں کا سامان ہوتا لہذا ۱۲ ربیع الاول کا دن ایسا فضیلت والا دن ہے کہ جس پر ساری عیدیں ان کی خوشیاں، تمام عبادتیں و ریاضتیں ہیں اور مومن کے لئے تمام عیدوں سے بہتر دن ہے اور خود آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دو شنبہ کے دن خود روزہ رکھ کر ہم کو شکرانہ ادا کرنے کا ایک طریقہ بتا دیا ہے اور اس میں درود شریف کثرت سے پڑھنا سب سے بہتر ہے۔

ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے لئے منبر رکھوایا جس پر بیٹھ کر انہوں نے آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بلند ترین عظمتوں کے قصیدے پڑھے جس میں کوئی مبالغہ آرائی، لفاظی و منظر نگاری نہیں تھی۔ اسی طرح بہت سے شعرائے کرام کے قصیدے اور نعتیں پائی جاتی ہیں لیکن انفرادی طور پر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن مجید اور درود شریف کی کثرت کرتے تھے

پیشک اللہ اور اس کے فرشتے نبی احمد و محمد و محمود صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والوں (میری اتباع و فرمانبرداری میں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام پورے آداب و احترام، اعزاز و اکرام کے ساتھ بھیجو۔ اللھم صل سیدنا و نبینا

نعت گوئی کی اہمیت کا اس بات سے

خود اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ترین بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خود نعت خوانی فرمائی ہے۔

خلاق کائنات نے محمد و احمد و محمود کے نام سے مشرف فرمایا جس کے لئے کہا گیا ہے 'بعد از خدا بزرگ تو ہی قصہ مختصر اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں خود ارشاد فرمایا ہے کہ پیشک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی احمد و محمد و محمود صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں۔

محمد و علی آل سیدنا محمد و بآرک و سلم تسلیما کثیراً کثیراً کثیراً۔ لہذا ہر ایمان لانے والا جس کی بنیاد اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و اطاعت، بندگی و عظمت کو تسلیم کرنا دین بتایا ہے اور اسے مقصد حیات اور نجات آخرت کا سبب بھی بنایا ہے۔ ان کی ذات پر

کائنات آدم و عالم میں اللہ تعالیٰ کی سب سے برگزیدہ شخصیت خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے خارجی و باطنی صفات اور آپ سے رونما ہونے والے تمام معجزات و کرامات کا منظوم بیان نعت ہے۔ علمائے ادب نے نعت کے موضوعات کی بنیاد پر اس کی مختلف طریقوں سے تشریحات و توضیحات فرمائی ہیں لیکن نعت کا اساسی موضوع نبی اکرم کی سیرت کو ہی قرار دیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نعت گو کے لئے قدم قدم پر بڑی احتیاط کی ضرورت درپیش ہوتی ہے اس لئے کہ ذرا سی لفظی اور فکری لغزش ایک نعت گو کو بجائے ثواب کے عتاب کا مستحق بنا دیتی ہے لہذا نعت کے لئے پاکیزہ فکر، لفظوں کا تصرف، تشبیہات و استعارات، صنائع و بدائع کا استعمال بڑی احتیاط سے کرنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی شیرازی نے صنف نعت کے لئے یہ کہا ہے کہ نعت کہنا گویا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔

نعت گوئی کی اہمیت کا اس بات سے خود اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ترین بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خود نعت خوانی فرمائی ہے۔ خلاق کائنات نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو محمد و احمد و محمود کے نام سے مشرف فرمایا جس کیلئے کہا گیا ہے 'بعد از خدا بزرگ تو ہی قصہ مختصر' اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں خود ارشاد فرمایا ہے کہ

اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب نبی کا تقرب حاصل کرنے اور آخرت کا سامان مہیا کرنے کے لئے تمام عاشقان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر کثرت سے درود و سلام کا وظیفہ ورد کرتے رہتے ہیں۔ قرآن خود نعت نبی کا شاہکار ہے جس میں آقا کی جس طرح تعریفیں کی گئی ہیں وہ بیان سے باہر ہیں۔

ہر زمانے میں لوگوں نے اپنے اپنے طریقوں سے ماہ ربیع الاول کی برکتوں کو حاصل کرنے کے سامان کئے ہیں۔ انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی محفلوں میں بھی۔ ایک غریب بڑھیا نے سال بھر سوت کات کر اس کی آمدنی سے محفل میلاد منعقد کی تو بادشاہوں اور امیروں نے انتہائی شاہانہ انداز میں اپنی دولت نثار کی ہے۔ قرآن درود شریف اور ذکر فضائل کی محفل میلاد منعقد کر کے نبی کی سنت میں روزے بھی رکھے ہیں اور خیر و خیرات اور لنگر بھی بنائے ہیں۔ حریم شریفین کے علاوہ ہر مسلم آبادی میں خاص لکھنؤ شہر میں بھی کتنی جگہوں پر گھروں میں، چوراہوں پر صفائی اور سٹرائی کے ساتھ اپنی وسعت کے اعتبار سے سجاوٹ و چراغاں کے ذریعہ ۱۲ ربیع الاول کو پورے شہر کو روشنیوں سے سجاتا جاتا تھا۔ محفل میلاد شریف میں نبی کی عظمتوں کے بیان کے ساتھ آپ کی سنتوں کو بیان کیا جاتا تھا اور لوگوں کو اللہ کے غضب سے ڈرا کر ایمان کی تکمیل باہمی رواداری، اخلاق و انسانیت کے پیغام دئے جاتے تھے۔ یہ تبلیغ کا کام ہوتا تھا، گھروں میں ضیافتیں ہوتی تھیں، چوراہوں پر جگہ جگہ لنگر دن بھر چلتے تھے۔ مدرسہ فرقانیہ کے مولانا عین القضاة جو حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے شاگرد رشید تھے، ان کے یہاں سیروں زعفران پسویا جاتا تھا جو بریانی اور کھیر میں ڈالا جاتا تھا اور پورے دن لنگر جاری رہتا تھا۔ اسی طرح جھوائی ٹولہ اور حاجی فقیر محمد تمبا کو والے دریائی ٹولہ، مچھلی مجال کے علاوہ میلاد کی شاندار محفلیں اور لنگر

ہوتے تھے خاص طور سے امین آباد پارک اور ہرن پارک چوک اور سبزی منڈی کی رات بھر کی محفل میلاد و نعتیہ مشاعرہ کا اہتمام اب بھی جاری ہے۔

ربیع الاول سے پہلے گھروں کی پتائی اور صفائی

ہر زمانے میں لوگوں نے اپنے اپنے طریقوں سے ماہ ربیع الاول کی برکتوں کو حاصل کرنے کے سامان کئے ہیں۔ انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی محفلوں میں بھی۔ ایک غریب بڑھیا نے سال بھر سوت کات کر اس کی آمدنی سے محفل میلاد منعقد کی تو بادشاہوں اور امیروں نے انتہائی شاہانہ انداز میں اپنی دولت نثار کی ہے۔ قرآن درود شریف اور ذکر فضائل کی محفل میلاد منعقد کر کے نبی کی سنت میں روزے بھی رکھے ہیں اور خیر و خیرات اور لنگر بھی بنائے ہیں۔ حریم شریفین کے علاوہ ہر مسلم آبادی میں خاص لکھنؤ شہر میں بھی کتنی جگہوں پر گھروں میں، چوراہوں پر صفائی اور سٹرائی کے ساتھ اپنی وسعت کے اعتبار سے سجاوٹ و چراغاں کے ذریعہ ۱۲ ربیع الاول کو شہر جگمگاتا تھا۔ محفل میلاد شریف میں نبی کی عظمتوں کے بیان کے ساتھ آپ کی سنتوں کو بیان کیا جاتا تھا اور لوگوں کو اللہ کے غضب سے ڈرا کر ایمان کی تکمیل باہمی رواداری، اخلاق و انسانیت کے پیغام دئے جاتے تھے۔ یہ تبلیغ کا کام ہوتا تھا، گھروں میں ضیافتیں ہوتی تھیں، چوراہوں پر جگہ جگہ لنگر دن بھر چلتے تھے۔ مدرسہ فرقانیہ کے مولانا عین القضاة جو حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے شاگرد رشید تھے، ان کے یہاں سیروں زعفران پسویا جاتا تھا جو بریانی اور کھیر میں ڈالا جاتا تھا۔

کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ خاص طور سے ہمارے بچپن میں ۱۹۵۰ء میں ربیع الاول سے پہلے گھر کی پتائی، صفائی اور روشنی کا انتظام، جھاڑ اور روشنی کی بانڈیاں

تیار کی جاتی تھیں۔ بعد مغرب گھر پر میلاد حضرت والد ماجد علامہ مفتی محمد عتیق میاں رحمۃ اللہ علیہ پڑھتے تھے اور چھوٹے بتائشے کا تبرک بانٹا جاتا تھا۔ بارہویں شب کو بعد مغرب بیان گھر پر، بعد عشاء ہرن پارک پر اس کے بعد پھر گھر پر درود شریف اور قرآن پاک کی تلاوت رات بھر ہوتی تھی۔ آخری بیان صبح ولادت کے وقت جس میں کھیر کی بانڈی کا تبرک ہوتا تھا، اس کے بعد ریح صدیقی کی مسجد میں، پھر نکسال میں چھا جو صاحب کے یہاں قدم مبارک کی زیارت اور حضرت کو بیان کرتے۔ اس کے بعد پورا دن اور پھر رات کو مختلف محلوں میں یہ سلسلہ پورا مہینہ چلتا تھا۔ تقریباً یہی حال ہمارے دادا حضرت شمس العلماء علامہ عبدالحمید کے زمانے میں بھی تھا کہ وہ بھی تقریباً دو ماہ تک لکھنؤ اور آس پاس کے اضلاع میں اپنے مریدین کے حلقہ میں محفل میلاد کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔ مدح صحابہ اور مدح اہل بیت کے لئے ان کے لکھے ہوئے سلام اور قصیدے پڑھے جاتے تھے اور بہت مقبول تھے۔ الغرض لکھنؤ والے بھی پورے مہینے اپنی اپنی بساط کے اعتبار سے نذرانہ خلوص و عقیدت و محبت پیش کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتے تھے اور علمائے فرنگی محل جو ابویوب انصاری کی اولاد ہیں، اپنے جد امجد میزبان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ادا کرنے میں اور اپنے آقا و مولیٰ کے حق غلامی اور نمک خواری پیش کرنے کی کوشش کرتے تھے جس کے اثرات پورے سال بھر رہتے تھے اور اب بھی ربیع الاول کا مہینہ سبھی کے لئے خیر و برکت کا مہینہ ہے لیکن اب دنیا داری میں مبتلا لوگوں میں وہ جذبہ غلامی و سرشاری، عقیدت مندگی و انکساری مفقود ہوا جا رہا ہے۔ اب عبادت کی بھی تجارت ہونے لگی ہے اور کبھی دل کہتا ہے کہ کاش کوئی لوٹا دے مجھے بیتے ہوئے دن۔

□□□

عصمت آپا اور ان کے طفیل میں



قاضی عبدالستار

4/1082، سرسید نگر، علی گڑھ

موبائل: 7417780295

چکی تھی۔ شاہدہ قیمتی زیورات اور عمدہ کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ آپا چل گئیں اور بولیں۔

”اللہ تم تو بالکل رانی صاحب لگ رہی ہو۔“

پھر وہ ہمیشہ رانی صاحب ہی کہتی رہیں۔ گھنٹوں باتیں ہوتی رہیں۔ جاوہر کی باتیں، علی گڑھ اور ممبئی کی باتیں، مجاز اور منٹو کی باتیں ہی باتیں۔ میں بہت کم بولتا وہ مجھے بلکارتیں لیکن میں چپ رہتا انہیں سنا کرتا۔

اس روز میں اسٹاف کلب جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ شاہدہ بہت قریب آئیں اور بولیں میرے ساتھ آپا کے پاس چلیے میں ان کو مدعو کرنا چاہتی ہوں۔ ہم دونوں پرنسپل ٹریگ کالج کے گھر پہنچ گئے آپا بہت خوش ہوئیں۔ شاہدہ کو گلے لگایا وہاں جو خواتین موجود تھیں ان سے تعارف کرایا۔ جب شاہدہ نے کہا آپا پرسوں شام ہمارے ساتھ کھانا کھائیے۔ آپا نے چمک کر جواب دیا کل کیوں نہیں؟ شاہدہ بہت کسمپاسی پھر عرض کیا میں آپ کو لہسن کی کھیر کھلانا چاہتی ہوں۔ کل اس کا پکنا ممکن نہیں ہو سکتا آپا نے خوش ہو کر فرمایا لہسن کی کھیر کے لیے میں دو چار دن رک سکتی ہوں، آپا نے کھیر پسند کی۔

میں روشن محل میں تاجم سلطان کے ساتھ بلیر ڈھیل رہا تھا کہ تاجم سلطان کی خادمہ نے میری طرف فون بڑھا دیا۔ سلام مچھی شہری صاحب فرما رہے تھے۔ علی منزل میں عصمت آپا انتظار کر رہی ہیں فوراً پہنچئے۔ علی منزل نواب لوہارو کی کوٹھی تھی۔ جس کی قبر پر مٹی اسٹوری بلڈنگ کھڑی ہے میں علی منزل بہت

۱۹۵۶ء میں جب عصمت آپا پہلی بار شعبہ اردو میں تشریف لائیں تو میرا صرف ایک ناول شکست کی آواز شائع ہوا تھا۔ لیکن محفل کے اختتام پر میرے پاس آئیں گھر کا پتہ پوچھا اور مسکراتی ہوئی چلی گئیں۔ دوسرے دن آپا تشریف لے آئیں تو میں بدحواس ہو گیا۔ ناشتے کے لیے نوکر کو دوڑایا۔ میں ان دنوں گرین

ایک دن قاضی صاحب کا فون آیا کہ پندرہ بیس سالوں میں یہ پہلا موقع ہے کہ کسی رسالہ نے مجھے Provoke کیا۔ وہ ’نیادور‘ کے اگست کے شمارے کی بات کر رہے تھے۔ کہنے لگے کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس پر کچھ لکھوں، ہم نے کہا اس میں اجازت کی کیا بات ہے۔ کچھ دنوں بعد پھر فون آیا کہ ’مضمون ذرا طویل ہو رہا ہے۔ ہم نے کہا آپ کے ایک ایک لفظ کا پوری اردو دنیا انتظار کرتی ہے۔ آپ تحریر کی طوالت کی فکر نہ کریں۔‘ ’نیادور‘ کے اگست کے شمارے پر تبصرے کے بہانے قاضی صاحب کی یادوں کا یہ آبشار بطور خاص پیش ہے۔ (ایڈیٹر)

بلبل چائے اور عبداللہ سگریٹ پیتا تھا۔ آپا نے ایک پیالی چائے اور دو سگریٹ پیے۔ میں لکھنؤ میں رضیہ مجاہد ظہیر صاحبہ کو سگریٹ پیتے دیکھ چکا تھا اور وہ مجھے بہت اچھی لگی تھیں۔ آپا بھی سگریٹ پیتے ہوئے بہت پیاری لگیں۔

دوسری بار آپا تشریف لائیں تو میری شادی ہو

’نیادور‘ کے مدیر سہیل وحید کے بارے میں جب پتہ چلا کہ یہ قمر رئیس کے شاگرد ہیں تو قمر کے ایک لفظ نے یادوں کا پورا انکار خانہ کھول کر ڈال دیا۔ کیسی کیتی زرکار، زرتاب اور زر پاش محفلوں کا کارواں جگمگ نے لگا۔ کہاں کہاں تھیں ٹھنچی، کہاں کہاں ساغر توڑے، یاد آنے لگا۔ پچاس برس کی دوستی میں صرف ایک واقعہ ایسا ہوا جس کا قلق آج بھی ہے۔ سردار جعفری اور غلام ربانی تاباں کی ہدایت پر قمر نے اصرار کیا کہ میں آل انڈیا انجمن ترقی پسند مصنفین کے صدر کا منصب قبول کروں لیکن میں نے سختی سے انکار کر دیا۔ اس لیے کہ میں برلا مندر دہلی کے ہال میں جنوادی لیکھک سنگھ کے استھاپنہ دوس پر دھواں دھار تقریر سے افتتاح کر چکا تھا۔ مجھے باور کرایا جا چکا تھا کہ میں جنوادی لیکھک سنگھ کا سن رکھشک منتخب ہو چکا ہوں۔

”کتنے ہمارے ساتھ کے بہار مر گئے“

میگزین میں کم پڑھتا ہوں لیکن نیادور اگست شمارے کے ٹائٹل پر عصمت چغتائی کی تصویر دیکھ کر فوراً پڑھنے لگا۔ ڈاکٹر صبیحہ انور کی تحریروں نے متاثر کیا، اس عمر میں پہلی بار ان کو فون کیا مبارک باد دی۔ ہدایت کی کہ اردو ادب کی واحد خاتون نقاد ممتاز شیریں کی مسند خالی پڑی ہے۔ ان کی بعض تحریر آج کے کئی پیشے و نقادوں کی موٹی موٹی کتابوں پر بھاری پڑتی ہیں۔ ممتاز شیریں کو غور سے پڑھیے۔ لکھنے اور مسند کو دو بوج لیجئے۔

گیا ہوں۔ قیام بھی کر چکا ہوں۔ آنریبل فخر الدین علی احمد کی تین چھوٹی بہنیں تھیں۔ حمیدہ سلطان، نجست سلطان اور اختر آرا بیگم۔ حمیدہ آپا جان مجھے اپنا چھوٹا بھائی بنا چکی تھیں۔ نجست سلطان موم کی مورت تھیں۔ حاجتا اٹھتی بیٹھتی ضرور نا بولتی چالتیں۔ اختر آرا بیگم ہر طرح سے شہزادی معلوم ہوتیں۔ فکشن سے عشق کرتیں مجھے بھائی صاحب کہتیں۔ میری کتابیں فخر الدین علی احمد صاحب کو انھیں نے پڑھوائیں۔ میری شاگرد نہیں تھیں لیکن شاگردوں سے زیادہ احترام کرتیں۔ عصمت آپا کو وہی علی منزل لاتیں اور پر تکلف دعوتیں کرتیں۔ اختر آرا بیگم آنریبل فخر الدین علی احمد کی سب سے لاڈلی بہن تھیں۔ آنریبل اندرا گاندھی کی نجی محفلوں میں باریاب۔ آپا جان کہتیں تھیں اندراجی سے پہلا تعارف اختر بیگم نے ہی کرایا تھا۔

علی منزل میں پوری محفل آراستہ تھی۔ صحن میں ایرانی اور مصری قالین پڑے تھے ان پر آرام وہ کر سیاں لگی تھیں۔ فخر الدین علی احمد قاضی عبدالودود بیر سرتاج الدین (آسام) لہار اور ودلی کے کچھ امراء شرفاء رضیہ سجاد ظہیر صاحبہ اور ڈاکٹر عابد حسین کے جلو میں عصمت آپا سنہرے بارڈر کی سفید ساری میں چمک رہی تھیں سلام صاحب نے قاضی عبدالودود سے صدارت کی گزارش کی۔ انہوں نے انکار کیا حمیدہ آپا جان لپک کر گئیں، مصر ہوئیں فخر الدین علی احمد صاحب نے بھی اصرار کیا تب قاضی صاحب اٹھے اور مسند صدارت پر تشریف فرما ہوئے۔ سلام صاحب نے ناظم کی حیثیت سے کہانی پڑھنے کی لئے میرا نام پکارا۔ میں نے کہانی پڑھی نام یاد نہیں میرے بعد صالحہ عابد حسین صاحبہ بیگم عابدہ احمد صاحبہ کے پہلو سے اٹھیں افسانہ پڑھا رضیہ سجاد ظہیر صاحبہ نے معذرت کر لی۔ اب عصمت آپا مسند زریں پر تشریف فرما ہوئیں۔ اپنا مشہور افسانہ 'چوٹی کا جوڑا' پڑھا۔ قاضی صاحب نے ہر افسانے پر اپنی صدارتی رائے پیش فرمائی۔

عصمت چغتائی عورتوں کی زبان لکھنے میں ماہر ہیں۔ اوسط درجے کے خاندانوں کی خواتین کی جذباتی پیش کش اچھی ہے چوٹی کا جوڑا اردو کے اچھے افسانوں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ اس کے بعد قاضی صاحب نے محفل کو گھور کر دیکھا اور فرمایا میں ایک جملہ معترضہ عرض کرنا چاہتا ہوں میں جب کرسی صدارت پر بیٹھا تو کچھ آنکھوں میں تھیر کی چمک دیکھی۔ یعنی جس محفل میں عصمت چغتائی بیٹھی ہوں اس کی صدارت میں نے جو تحقیق کی شدبدا رکھتا ہے کیسے قبول کر لی۔ تو سنئے فخر الدین علی احمد، بیر ستر نور الدین احمد اور خاکسار نے ایک ساتھ آکسفورڈ سے بی اے آنرز کیا ہے۔ ہم تینوں کا مطالعہ خصوصی یورپین فکشن تھا۔ ہم لوگوں نے امتحان میں جو ستر ستر اسی اسی صفحے لکھے ہیں وہ اگر ہمارے پاس ہوتے اور ہم ان کا ترجمہ چھپوا دیتے تو اردو فکشن کی بعض تنقیدی کتابوں پر بھاری پڑتے۔ مغربی تنقید صفات کے استعمال میں بہت محتاط ہوتی ہے جب کہ ہماری ایٹائی تنقید صفات کا استعمال دال بجات کی طرح کرتی ہے۔ آپ نے میری آواز اتنی دیر تک برداشت کی اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں محفل کے اختتام پر انتہائی پر تکلف کھانے کا اہتمام تھا۔ آپا نے شیرینی کے تینوں کورس کھائے اور شوق سے کھائے۔ گھڑی دیکھی گئی تو رات کا گیارہ بج رہا تھا لیکن آپ کے چہرے پر نہ تنگ تھی نہ بیزاری پوری خوشی اور خرمی سے رخصت ہوئیں۔

قاضی عبدالودود کے اس بیان کی روشنی میں اگر ہم کلیم الدین احمد کی طرح اردو تنقید پر نظر ڈالیں تو اردو نثر کی اصناف میں سب سے کمزور صنف کا نام تنقید ہے۔ اردو تنقید اردو ادب کا بدگوشت ہے۔

ادب کے دوڑتے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ کے زخم پر بیٹھی ہوئی ماضی کا نام تنقید ہے۔ تنقید کے تولد ہونے سے پہلے عظیم شاعری پیدا ہو چکی تھی۔ میر، غالب، انیس اور اقبال کی شاعری کی روشنیوں کے

بینارمنور ہو چکے تھے۔ تنقید کے وجود میں آنے کے بعد کوئی عظیم شاعر پیدا نہیں ہوا۔ یہ تو عصمت چغتائی اور ان کے ہم عصروں کا کمال ہے کہ تنقید کی آدھا پانی کے باوجود انسانی ادب کے معجزات سرانجام ہو سکے۔ عصمت چغتائی اور ان کے ہم عصر اگر مغرب کی کسی زبان میں پیدا ہوئے ہوتے تو ان میں سے ہر ایک پر کم از کم ایک ایک درجن تنقیدی کتابیں وجود میں آ چکی ہوتیں۔ لیکن ہماری بیچاری تنقید دلالی اور گروہ بندی اور خود پرستی کے دلدل میں دھنسی پڑی ہے۔ اگر آپ بعض پیشرو نقادوں کا جائزہ لیجئے تو عجب تماشہ نظر آتا ہے۔ یعنی شعر کہانا نہیں گیا۔ افسانہ لکھا پڑھنا نہیں گیا۔ دو چار کتابیں سامنے رکھیں کچھ کاغذ، قلمی اور گوند فراہم کیا۔ ایک کتاب تیار ہو گئی نقاد ہو گئے۔ چل نکلے حکام رسی پیدا کی۔ خوشامد کے ڈھیر لگا دیے ایوارڈ مل گئے۔ گروہ بن گئے۔ جریدے نکلے لگے۔ عظمتوں کی ریوڑیاں چھاور ہونے لگیں شہرت کے ڈھول بجنے لگے، جب تک جیتے ہیں طولہ ماندہ چل رہا ہے جس دن آنکھ بند ہوئی اردو کی تاریخ کے کوڑے دان میں چھینک دیے جائیں گے۔

عصمت آپا کے یہ چند صفحات جن میں جدیدیت کے وجود میں آنے کا ذکر ہے غور سے پڑھے جانے کے قابل ہیں۔ ہمارے سامنے ہماری آرٹس فیٹیلٹی کے لاؤنج میں جدیدیت کی ولادت کا واقعہ سر زد ہوا۔ دہلی سے مورس ڈمبو صاحب تشریف لائے تھے۔ پروفیسر رائف رسل کی طرح عمدہ اردو بولتے تھے۔ ہمارے استاد محترم پروفیسر آل احمد سرور ان کی گود میں بیٹھے تھے۔ استاد محترم کے داہنے زانو پر شمس الرحمن فاروقی اور بائیں زانو پر گوپی چند نارنگ ڈٹے ہوئے تھے۔ باقی حضرات اپنی بساط کے مطابق ادھر ادھر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہال میں ڈاکٹر علیم جو بعد میں وائس چانسلر ہوئے، پروفیسر احتشام حسین صاحب اور پروفیسر ہر بنس لال شرما صاحب اور پروفیسر اختر

سے حکم دیا کہ بیٹھ جائے۔ پال بیٹھ گئے ہم کھڑے ہوئے۔ صدر محفل سرور صاحب کو مخاطب کیا۔

سر جس طرح فاروقی ہمارے مہمان ہیں اسی طرح پال بھی ہمارے مہمان ہیں۔ پال کو بولنے کا موقع دیا جائے ورنہ جلسے کی ڈسپلن کو برقرار رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ سرور صاحب نے اپنے غصے کو ضبط کیا۔

بھڑائی ہوئے آواز میں پال کو اجازت دی۔ دوسرے اجلاس میں بھی ہم نے، اقتدار عالم خاں نے اور اختر علی خاں نے گرجتی برستی تقریریں کیں۔ اجلاس کے اختتام پر ڈاکٹر عظیم صاحب، احتشام صاحب، پروفیسر شرما اور اختر اور بیوی صاحب مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے ہال سے باہر آئے۔

گھر پہنچ کر لباس تبدیل کر کے بیٹھا تھا کہ نو کرنے اطلاع دی کوئی انگریز آیا ہے۔ ڈرائنگ روم میں مورس ڈبہ کھڑے تھے۔ کمرے کے قالین صوف، پردے سب غور سے دیکھ رہے تھے میرے قریب بیٹھ کر فرمایا۔ آپ جیسا گریٹ رائٹر کرائے کے اس مکان میں رہتا ہے رکشے پر چلتا ہے افسوس کا مقام ہے علی گڑھ کی سب سے بڑی موٹر آپ کی ہونی چاہیے علی گڑھ کی سب سے عمدہ کوٹھی آپ کی ہونی چاہیے آپ مجھ کو صرف دارا شکوہ سمیت اپنی کتابوں کے انگریزی میں ترجمے کی اجازت دے دیجئے اور دونوں تھیلیوں پر شفیق کا گولڈ پلینڈ قلم کاسیٹ پیش کیا۔

”یہ تجھ قبول کیجئے“

میں نے ان کی قمیص سے ٹکونی پنسل نکال لی۔

قلم کاسیٹ ان کے کھلے ہوئے بیگ میں رکھا۔

”آپ کو یاد کرنے کے لیے یہ پنسل کافی ہے۔“

ڈبوں نے اپنا کارڈ مجھے دیا اور فرمایا کہ اپنا جواب مجھے اس پتے پر بھیج دیجئے گا۔ چھ مہینے میں سال بھر میں۔ میں ڈبوں سے اجازت لے کر اندر گیا۔ شاہدہ سے کہا جائے چاندی کے سیٹ میں قاعدے سے بھیجو۔ باہر آیا تو کمرے میں ڈبوں نہیں تھے۔ مسند پر

کھڑے باتیں کر رہے تھے میرے سلام کا جواب ایسی شفقت اور اتنی گرمجوشی سے دیا کہ کلچر ہاتھ بھر کا ہو گیا۔ احتشام صاحب نے مجھے اپنے قریب بلایا اور بہت افسردگی سے پوچھا۔

”تم ریڈر نہیں ہونا چاہتے؟“

مطلب تھا کہ سرور صاحب ناخوش ہو چکے ہیں تم ریڈر نہیں ہو سکتے۔ میں نے عرض کیا۔

”سرسر ہم نے کسٹوڈین اور خاتمہ زمینداری کا عذاب جھیلا ہے۔ ریڈر شپ کو بھی دیکھ لیں گے۔“

ادب کے دوڑتے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ کے زخم پر بیٹھی ہوئی مکاتھی کا نام تنقید ہے۔ تنقید کے تولد ہونے سے پہلے عظیم شاعری پیدا ہو چکی تھی۔ میر، غالب، انیس اور اقبال کی شاعری کی روشنیوں کے مینار منور ہو چکے تھے۔ تنقید کے وجود میں آنے کے بعد کوئی عظیم شاعر پیدا نہیں ہوا۔ یہ تو عصمت چغتائی اور ان کے ہم عصروں کا کمال ہے کہ تنقید کی آ پادھانی کے باوجود افسانوی ادب کے معجزات سرانجام ہو سکے۔ عصمت چغتائی اور ان کے ہم عصر اگر مغرب کی کسی زبان میں پیدا ہوئے ہوتے تو ان میں سے ہر ایک پر کم از کم ایک ایک درجن تنقیدی کتابیں وجود میں آ چکی ہوتیں۔

پروفیسر پنڈت ہرنس لال شرمانے اپنی ٹوپی ترچھی کی اور بہت ٹٹطنے سے بولے۔

”قاضی عبدالستار تم اکیلے نہیں ہو۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ آؤ ہمارے ساتھ چلو۔“

ہاں ابھی بھرا نہیں تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی کمیونسٹ پارٹی کی کارڈ ہولڈرز کا ایک پرائیوٹ کی کرسیوں پر جم گیا۔ دوسرا اجلاس برابر کا تھا۔ جدیدیوں کا کلب مر جھا گیا تھا۔ جو گلیڈر پال کچھ کہنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ شمس الرحمان فاروقی نے بہت تحکم

اور بیوی صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ استاد محترم پروفیسر آل احمد سرور جو لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرپرست تھے اور جن کے در دولت پر انجمن کے جلسے پابندی کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ ہندوستان میں شاید ہی اردو سے متعلق کوئی ایسی کمیٹی ہو جس کے وہ صدر، سکریٹری یا بہت اہم ممبر نہ ہوں۔ وہ ہندوستان کی حد تک اردو دنیا کے سب سے طاقتور پروفیسر تھے۔

مائیک پر تشریف لائے اور انتہائی جارحانہ انداز میں انجمن ترقی پسند مصنفین پر لعنت بھیجی اور جدیدیت کی ولادت کا اعلان کر دیا۔ پھر تو جیسے طریقہ ہو گیا کہ جو شخص بھی مائیک پر آتا پہلے دو چار منٹ اچھل کود کر ترقی پسندی پر لعنت بھیجتا پھر اپنی بات کہتا یعنی نو مولود کو مبارک باد دیتا۔ تقریباً دو گھنٹے یہ تماشہ ہوتا رہا جب استاد محترم کا شعلہ خوج شمس الرحمان فاروقی کا تکبیر اور محمود ہاشمی جیسے تیسرے درجے کے لوگوں کا تدمغ ناقابل برداشت ہو گیا تو میں نے ہاتھ اٹھا یا استاد محترم کے ساتھ شعبہ اردو کے اساتذہ نے بھی مجھے حیرت سے دیکھا۔ سرور صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے اجازت دی۔ مائیک پر جاتے ہوئے کسی نے کان میں کہا سوچ لو سرور صاحب دشمن ہو جائیں گے ڈپارٹمنٹ میں رہنا دشوار ہو جائے گا۔ لیکن زمیندار کے پوت کی رگ بغاوت پھڑک چکی تھی۔ ترقی پسندی کے تحفظ اور جدیدیت کی مخالفت میں دھواں دھار تقریر کی سب سے زیادہ زور سے تالی ڈاکٹر عظیم اور استاد مکرم پروفیسر احتشام حسین اور پنڈت ہرنس لال شرمانے بجائی۔ میرے ہلٹے ہی پروفیسر اقتدار عالم خاں اور پروفیسر اختر علی خاں مائیک پر آگئے اور انگارے اگلنے لگے۔ سرور صاحب نے گھبرا کر اجلاس کے اختتام کا اعلان کر دیا۔

دوسرے اجلاس کے لیے رکشے سے اترتا تھا کہ فیکلٹی آف آرٹس کے دروازے پر ڈاکٹر عظیم، استاد مکرم پروفیسر احتشام حسین اور پنڈت ہرنس لال شرما

اس کا جوش و ہنگامہ کی بول اور گولڈ میڈل شیف، کا سیٹ رکھا تھا۔ مورس ڈیمو نے اتنا قیمتی تحفہ شاید سرور صاحب کو بھی نہ دیا ہو۔

میں نے ڈاکٹر علیم صاحب سے مشورہ کیا۔ جواب ملا جو کچھ ڈیمو نے کہا ہے وہ سچ ہے کوٹھی اور موٹر سب ہو جائے گی۔ لیکن آپ کا قلم غلام ہو جائے گا اور آپ جیسے خود دار آدمی کی زندگی عذاب۔ مورس ڈیمو امریکی حکومت کے کسی عملے کے سکرٹری کی حیثیت سے رٹائر ہو چکے ہوں گے۔ میری دعا ہے وہ جہاں بھی ہوں تندرست ہوں خوش و خرم ہوں۔ وہ کبھی کبھی یاد آتے ہیں۔

دوسرے دن کے دونوں اجلاس پھیکے رہے۔ ایک ڈنک رہے۔ تلواریں نیام کا گھونگھٹ اوڑھے پڑی رہیں۔ نئے چپروں اور مردہ آوازوں کے ساتھ سمینار ختم ہو گیا۔

چند روز گزرے تھے کہ آپا دندنا ہی ہوئی علی گڑھ آگئیں۔ مجھے نہیں معلوم وہ خود سے آئی تھیں یا ممبئی کی انجمن ترقی پسند مصنفین نے انہیں بھیجا تھا وہ سیدھی میرے گھر تشریف لائیں۔ نو مولود (جدیدت) کی خیریت معلوم کرتی رہیں میں نے ڈاکٹر علیم صاحب، پروفیسر نور الحسن صاحب (وزیر تعلیم) اور پروفیسر مونس رضا کے دو لختا نون پر دھڑا دھڑ جلسے کیے عصمت آپا تڑا تڑ گنگو کرتی رہیں ترقی پسندی کا وظیفہ پڑھتی رہیں۔ میں نے افسانہ نگاروں کی جو انجمن راوی کے نام سے بنائی تھی اس کی ہر اتوار کو میٹنگ ہوتی رہی ہر جلسے میں ہر میٹنگ میں طالب علموں اور طالبات کا نجوم رہا۔ ہر جلسے میں آپا بولتی رہیں۔ جدیدیت کے سمینار نے طالب علموں اور نوجوان اساتذہ کے خام ذہنوں پر ترقی پسندی کے خلاف ننگلیک اور اشتباہ کی جو چادر تان دی تھی وہ ان جلسوں نے پھاڑ کر چھینک دی۔ عصمت آپا اپنی اور ہماری کامیابی کے نشے میں سرشار میرے ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھیں طلباء اور طالبات کے جھرمٹ

میں چپک رہی تھیں کہ شعبہ اردو کے چیرا سی میاں خاں آگئے اور کہا کہ صاحب (پروفیسر آل احمد سرور) نے آپ کو فوراً دیکھا ہے سخت ناخوش ہیں آپا نے مجھے گھور کر دیکھا جب تک تم واپس نہیں آؤ گے میں یہیں بیٹھی رہوں گی۔

استاد محترم کے ڈرائنگ روم میں دربار لگا تھا خلیل الرحمن اعظمی، وحید اختر اور شہریار وغیرہ بہت جوش و خروش سے بول رہے تھے میرے داخل ہوتے خاموشی ہو گئی۔ سلام کے جواب میں اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ ہوا۔ شعبہ اردو کے دوسرے چیرا سی نے چائے کی پیالی پیش کی۔ خلیل الرحمن اعظمی نے میری طرف سگریٹ کا پیکٹ بڑھایا۔ میں نے کہا آپ جانتے ہیں میں استاد محترم کے سامنے سگریٹ نہیں پیتا۔

سرور صاحب میری طرف مڑے۔ جناب قاضی عبدالستار صاحب میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ آپ سے پہلی اور آخری بار کہہ دوں کہ آپ اپنی انجمن راوی کو بند کر دیں۔ بہت تماشے ہو چکے ہیں۔ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے میں نے چائے کی پیالی ہٹائی۔ کھڑا ہوا اور استاد محترم کی طرف دیکھ کر عرض کیا۔ ”بس یا اور کچھ“

سرور صاحب کا چہرہ بچوان کی چلم کی طرح دکھ رہا تھا آواز سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ چلم سے لوٹھی۔

”کیا اتنا کافی نہیں ہے“

میں کھڑا ہوا۔ بجائے آداب پیش کرنے کے سلام علیکم کیا اور چلا آیا۔ آپا نے سنا تو بھڑک گئیں۔ کہا میں علیم صاحب کے پاس ابھی جاتی ہوں۔ نور الحسن اور مونس رضا کو وہیں بلواؤں گی۔ تب بتاؤں گی۔

دوسرے دن صبح میں ناشتہ کر رہا تھا کہ ڈاکٹر علیم کا چیرا سی آ گیا۔ حاضر خدمت ہوا۔ پوری روداد سنی۔ سرور خدا کب سے ہو گئے؟ میں نے عصمت کو روک لیا

ہے آپ اتوار کو جلسہ کیجئے۔ سب سے پہلے تشریف لانے والوں میں ڈاکٹر علیم، پروفیسر نور الحسن (وزیر تعلیم) پروفیسر مونس رضا (جو دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے) اور شعبہ انگریزی کے سلامت اللہ خاں صاحب تھے۔ جب ہال بھر گیا تو ڈاکٹر علیم اٹھے فرمایا۔ میں اس جلسے کی صدارت کے لیے قاضی عبدالستار کا نام تجویز کرتا ہوں، پروفیسر نور الحسن نے تائید کی۔ آپا نے بھی افسانہ پڑھا۔ دھوم کی محفل تین گھنٹے تک جاری رہی۔ سرور صاحب کی ناخوشی برہمی میں بدل گئی۔

۹ جولائی ۱۹۵۵ء میں فیلو ہو کر علی گڑھ آیا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب کی نگرانی میں داخلہ ملا۔ رشید صاحب خود صاحب طرز نثر نگار اور اردو نثر کا ایک ستون تھے۔ پہلے ہی ملاقات میں میرا بابا یو ڈیٹا مانگا۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی پروفیسر یوسف حسین موسوی اور پروفیسر احتشام حسین کے ٹیوشینوں جو میرے تعریف و توصیف سے بھرے پڑے تھے پڑھتے رہے پہلا سوال ہوا۔ ”تکست کی آواز میں جو واقعات ہیں وہ حقیقی ہیں یا تخیلی؟ دوسرا سوال تھا کہ یہ نثر لکھنا کہاں سے سیکھا۔ میں اپنی بساط جواب عرض کرتا رہا۔ (بعد میں سلمیٰ صدیقی نے بتلایا کہ ابا میاں کو یہ ناول میں نے پڑھوایا تھا) تکست کی آواز نے ممتاز شیریں، قرۃ العین حیدر عصمت چغتائی اور آرزو بیل فخر الدین احمد کو یکساں طور پر متاثر کیا۔ باباناگ ارجن نے اسی ناول کو ہندی میں پہلا اور آخری خط کے نام سے شائع کیا اور لکھا ہندی میں جیسے دیہات پر لکھنا ہو اسے اس ناول کو تکست بک کی طرح پڑھنا چاہئے قاضی عبدالستار پریم چند ہے یہی پہلا ناول کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ اس ناول کو نفوس کے ایڈیٹر محمد طفیل نے جنہوں نے کسی شاعر کی چھپی ہوئی غزل تک شائع نہیں کی، دو چرخ محفل کے نام سے شائع کیا۔ علی گڑھ میں محمود الہی تنویر احمد علوی اور (مصاحب علی خاں) قمر

کو میں اختر بھائی کہتا تھا۔

اختر بھائی کے ویلے ہی سے ادرستان تک میری رسائی ہوئی اور پروفیسر کی خدمت میں گھنٹوں بیٹھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ میں نے بی اے آنرز میں ناپ کیا تھا، ایم اے میں ٹاپ کیا تھا گولڈ میڈل حاصل کیے تھے اس لیے پروفیسر کا قریب میسر آیا تھا۔ اردو نثر واجد علی شاہ اور مرثیہ پروفیسر کے محبوب موضوعات تھے۔ جب پروفیسر بولتے تھے تو درود یو ار ساکت کھڑے رہتے تھے نثر کا وہ کون سا پہلو ہے کون سا رمز ہے کون سا لکتہ ہے جس کے بارے میں ہم نے استاد معظم کی زبان مبارک سے نہیں سنا۔ نیر مسعود حیات ہوتے تو بہت دھوم دھام سے قلم اٹھاتا لیکن اب تو صرف شرعی جواب ہی دے سکتا ہوں۔ سہیل وحید نے بہت چھپتے ہوئے سوالات کئے ہیں لیکن نیر مسعود کے جوابات افسانوں ہی کی طرح مبہم ہیں۔

مرقوم ہے ”بس یہ کہ بیور اور خالص نثر ہونا چاہیے میں شعر کے اوزار سے کام نہیں لیتا ہوں بہت سے لوگ لکھنے میں ان کی رنگین عبارتیں پڑھتے ہیں قاضی عبدالستار جیسے ان کے یہاں تمام استعارے بھی ہیں، علامتیں بھی ہیں صاحب طرز لکھنے والے ہیں۔ اس کو برا نہیں کہہ سکتے ہم بس یہ کہ ہماری طبیعت اس طرف نہیں آتی۔“

کسی زمانے میں کسی آسمان سے ایسی کوئی کتاب نہیں اتری جس میں لکھا ہو کہ یہ نثر کے اوزار ہیں یعنی نثر کے زبور ہیں۔ نثر کو اپنی آرائش و زیبائش کے لیے کسی دیوانے (شاعر) کے دیوان سے فیضیاب ہونے کی ضرورت نہیں۔ نثر کا شجرہ نسب آسمانی کتابوں سے جاملتا ہے تمام آسمانی کتابیں نثر میں اتری ہیں۔ حسن زبان و بیان کا کوئی کمال ایسا نہیں جو اتم الکتاب قرآن میں موجود نہ ہو۔ حضرت موسیٰ جب طور پر اللہ سے کلام کرتے ہیں تو جواب نثر ہی میں آتا ہے۔ یعنی اللہ کی زبان بھی نثر ہے اور پیغمبر کی زبان بھی

جو علی گڑھ میں جامعہ اردو کے بانی مہمانی تھے بنایا کرتے تھے لیکن میرا نام ٹیبل پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے ہاتھ سے بنایا۔ پہلا رجسٹر مجھے ایم اے کا ملا۔ پورے ہفتے میں صرف آٹھ گھنٹے تھے جب کہ اصولاً لکچر رکو کم از کم چودہ گھنٹے دیے جانے تھے۔ چار گھنٹے ایم ایے کے تھے اور چار بی اے میں جدید نثر کے۔

۱۔ کچھ برس بعد چیچر مین پروفیسر صاحب نے لازمی اردو کے دو گھنٹے بڑھادے تھے۔

اردو ادب کی تدریسی دنیا میں پروفیسر مسعود حسن رضوی اور پروفیسر رشید احمد صدیقی سے بڑا کون پروفیسر تھا؟ پاکستان میں پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ کا نام تھا۔ دکن میں پروفیسر عبدالقادر سردری اور محی الدین قادری مثال تھے۔ بہار میں پروفیسر اختر اربوئی ممتاز تھے۔ ان تینوں پروفیسروں کو کسی طرح بھی مسعود صاحب اور رشید صاحب پر برتری نہیں حاصل تھی یہ تفصیل میں نے اس لیے تحریر کی کہ قارئین کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں اردو نثر کا ممتاز ترین طالب علم ہوں۔ ہندوستان میں کسی پروفیسر کے اتنی تعداد میں پروفیسر شاگرد نہیں ہیں جتنی تعداد میں میرے ہیں۔

صاحب رنائر ہوئے اور سردر صاحب صدر شعبہ ہوئے تو انہوں نے بھی میرا نام ٹیبل برقرار رکھا، یعنی میں مدتوں ایم اے کو شاعری اور بی اے کو جدید نثر پڑھاتا رہا۔ یہ سب کچھ اس لیے لکھنا پڑا کہ میں جدید ترین نثر کے پہلو سے واقف ہوں۔

اسی شمارے میں نیر مسعود کا انٹرویو بھی ہے۔ نیر میرے استاد معظم پروفیسر مسعود حسن رضوی کے دوسرے صاحبزادے ہیں۔ پروفیسر موصوف کے بڑے بیٹے پروفیسر اختر مسعود میرے سینئر دوست جن

رکس، پی ایچ ڈی میں داخلہ لے چکے تھے۔ اسی ناول نے مجھے اپنے ہم عصروں پر فضیلت عطا کی۔ اس حد تک کہ جب لکچر رشپ کی پوسٹ مشن ہوئی تو ان حضرات نے درخواست تک نہیں دی اس لیے کہ ان کو معلوم تھا کہ تفر میرا ہی ہوگا۔

رشید صاحب جب تک رنائر نہیں ہو گئے میں ان کی کلاسز میں پابندی سے بیٹھتا رہا۔ پہلی ملاقات کے آٹھویں دن سے پروفیسر مجھے ڈینڈی کہنے لگے اور آخر وقت تک ڈینڈی ہی کہتے رہے۔ قربت کا یہ عالم تھا کہ اگر حاضری میں تاخیر ہو جاتی تو سملٹی آیا آجاتیں۔ وہ آج کے لفتدرے پروفیسروں کی طرح نہیں تھے۔ ہر ملاقات پر پوچھتے کہ تم کیا لکھ رہے ہو۔ رشید صاحب ایم اے کی کلاس میں غالب اور بی اے میں جدید نثر پڑھاتے تھے۔ میں نے ان کی کلاس میں بیٹھنے کی اجازت مانگ لی تھی۔ نثر پر ان کا پہلا لکچر معراج العاشقین پر تھا۔ محاوراتی اور استعاراتی اسالیب پر انھوں نے بے محابا اور بے بدل لکچر دیے تھے۔

اردو ادب کی تدریسی دنیا میں پروفیسر مسعود حسن رضوی اور پروفیسر رشید احمد صدیقی سے بڑا کون پروفیسر تھا؟ پاکستان میں پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ کا نام تھا۔ دکن میں پروفیسر عبدالقادر سردری اور محی الدین قادری مثال تھے۔ بہار میں پروفیسر اختر اربوئی ممتاز تھے۔ ان تینوں پروفیسروں کو کسی طرح بھی مسعود صاحب اور رشید صاحب پر برتری نہیں حاصل تھی یہ تفصیل میں نے اس لیے تحریر کی کہ قارئین کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں اردو نثر کا ممتاز ترین طالب علم ہوں۔ ہندوستان میں کسی پروفیسر کے اتنی تعداد میں پروفیسر شاگرد نہیں ہیں جتنی تعداد میں میرے ہیں۔ اردو دنیا کے کسی مصنف کے اتنے مشہور و معروف فنکار شاگرد نہیں ہیں جتنے کہ میرے ہیں۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۵۵ء کو میرا تقرر ہوا۔ ڈپارٹمنٹ کا نام ٹیبل ڈاکٹر ظہیر الدین علوی

نثر ہے یہ جو ایک پرفریب خیال ہے کہ شاعری جزو پیغمبری ہے سراسر غلط ہے اس لیے کہ کسی شاعر پر پیغمبری نازل نہیں ہوئی۔ کسی پیغمبر نے دیوان تخلیق نہیں کیا۔

نثر وہ قلم دو عالم ہے جس کی پاپوش گوہر پوش کے ایک ٹوٹے ہوئے موتی کا نام شاعری ہے۔ اردو نثر کے پاس چار اسالیب ہیں۔ محاوراتی اسلوب، استعاراتی اسلوب، تمثیلی اسلوب اور صحافتی اسلوب جسے علمی اسلوب بھی کہا گیا۔ تمثیلی اسلوب میں ملا وجہی کی سب رس اور مولانا محمد حسین آزاد کے مضامین کے علاوہ ادب کی کوئی کتاب الموجد نہیں ہے۔ علامتی اسلوب بھی استعاراتی اسلوب میں تقریباً ضم ہو گیا۔ اس لیے آج عملی طور پر صرف تین اسالیب مروج ہیں۔ محاوراتی اسلوب، استعاراتی اسلوب اور علمی اسلوب۔ اردو نثر کی تاریخ میں ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی جس میں یہ تمام اسالیب بیک وقت روشن ہوں، منور ہوں، فروزاں ہوں یعنی رنگین کا لفظ ان کے افسانوں ہی کی طرح مبہم ہے۔ ادب کی صرف ایک صنف ہے جس کا ذکر اتم الکتاب میں موجود ہے۔ یعنی افسانہ۔ ارشاد ربانی ہے کہ کہانی کہتے رہو لوگ کچھ تو غور کریں۔ یعنی کہانی کے وجود کا بھی اعتراف ہے اور اس کی definition (تعریف) بھی کردی گئی۔ دوسرے الفاظ میں کہانی وہ ہے جسے پڑھ کر سن کر آدمی سوچتے غور کرنے پر مجبور ہو۔

افسانے کے نام پر جو بہم تحریریں لکھی جاتی ہیں وہ درحقیقت عاشقوں کے معشوقوں کے نام وہ مکتوب ہوتے ہیں جو پوسٹ نہیں کیے جاتے بلکہ کسی میگزین میں شائع کر دیے جاتے ہیں اور ایسی تحریریں Beneath the criticism کے ضمن میں آتی ہیں یعنی ان پر تنقید کرنا تنقید کا زیاں ہے۔

پیورنٹر، خالص نثر، خالص دودھ، خالص گھی، خالص شہد اور خالص کاٹن کی طرح خالص ادبی نثر اردو

نثر کی تاریخ میں نہیں لکھی گئی۔ لیکن خالص ادبی نثر کا نہیں خالص نثر کا سراغ لگایا جاسکتا ہے خاتون خانہ کی روزمرہ خرچ کی کتاب جس میں دھوبی کے کپڑوں کا حساب، بچوں کا جیب خرچ، فقیروں کی بخشش وغیرہ درج ہوا اور دو کا اندازوں کی خرید و فروخت کا اندراج کے رجسٹر میں خالص نثر ڈھونڈھی جاسکتی ہے۔ تھانے کے نشی اور کچہری کے ناظر کی تحریروں میں بھی خالص نثر کا ملنا دشوار ہے اس لیے کہ اردو زبان شیریں زبان ہے، شعری زبان ہے، اردو ہندوستان کی واحد بڑی زبان ہے جس کے پاس بولی نہیں ہے اردو زبان کے خمیر میں تشبیہ استعارہ اور علامت فطری طور پر موجود ہے ہمارا روزمرہ تک خالص نثر نہیں محاورے تو ہوتے ہی سوتے ہوئے استعارے ہیں مثلاً شہر کے ایک پڑھے لکھے متوسط درجے کے فرد سے گزارش کیجئے کہ جس وقت آپ سو کر اٹھتے ہو اس وقت سے سونے کے وقت تک اپنی گفتگو کے حساب پر غور کیجئے۔ بیوی بچوں سے عزیز و اقارب سے نوکر چاکر سے افسروں اور ماتحتوں سے ہم عمروں ہم منصبوں ہم بیالہ ہم نوالہ لوگوں سے ریستوران اور ہوٹلوں کے بیروں سوار یوں کے ملازموں سے آپ نے جو گفتگو کی ہے اس سے ہم کو یہ معلوم ہوگا کہ ہم کسی ارادے کے بغیر کتنی تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال کرتے ہیں۔

Paradox قول محال جو نثر کا بہت قیمتی زیور کہا جاتا ہے تشبیہ اور استعارے کے بغیر خلق نہیں کیا جاسکتا۔ شب گزیدہ پر تبصرہ کرتے ہوئے شمس الرحمن فاروقی نے لکھا کہ قاضی عبدالستار پیراڈاکسز کے بادشاہ ہیں۔ استعارے سے دامن بچانا ادبی نثر کی تخلیق سے دامن بچانے کے مترادف ہے۔

پیورنٹر کے معنی سادگی بھی کہے جاسکتے ہیں معلوم ہونا چاہیے کہ سادگی نفس نفیس کوئی قدر نہیں ہے سادگی ایک اضافی قدر ہے۔ سادگی صناعتی میں توازن کا نام ہے کون ہے جو تاج محل کی صناعت سے

انکار کر سکتا ہے کون ہے جو تاج محل کی سادگی کا منکر ہو سکتا ہے۔ صناعی دولت کے بغیر سادگی افلاس ہے۔ نان گوشت پکانے والا سادگی کے عشق میں نان گوشت نہیں پکاتا۔ وہ نان گوشت اس لیے پکاتا ہے کہ باقر خانی اور تاج پکانے کا ہنر نہیں جانتا۔ دری بنانے والا اصفہانی قالین نہیں بنا سکتا۔ گاڑھا بننے والا زربفت و کھواب نہیں بنا سکتا۔ نختوں میں کیلیں ٹھونکنے والا سونے میں گننے نہیں جڑ سکتا۔ لیکن سونے میں گننے جڑنے والا تختے میں کیلیں ٹھونک سکتا ہے۔ علی ہذا القیاس۔

جب ملکہ ایلیزا ہتھ افریقہ کے سفر پر گئیں (ملکہ کے لیے مشہور ہے کہ دنیا میں کسی خاتون کے پاس ملکہ سے زیادہ زیورات نہیں ہیں) تو ہمارے مشہور جرنلسٹ چیلا پیٹی راؤ نے لکھا ملکہ بہت سادگی کے ساتھ دربار میں تشریف لائیں وہ ہندوستانی راسلک کا اسکرٹ اور سیاہ موتیوں کا سٹ پہنے ہوئے تھیں میں نے علی گڑھ کے نواب زادوں سے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ کسی کے گھر میں سیاہ موتیوں کا سٹ نہیں ہے جب میں حیدرآباد گیا اور سرسار جنگ میوزیم یا نظام میوزم میں سیاہ موتیوں کا سٹ دیکھا تو کیور بیٹر نے پوچھنے پر بتلایا کہ سیاہ موتی بہت نازک ہوتا ہے ہلکی سی رگڑ سے بے آب ہو جاتا ہے۔ ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ جاتا ہے اور سفید موتی کے مقابلے میں بہت مزنگا۔ اس لیے وہ لوگ جو سیاہ موتی خرید سکتے ہیں نہیں خریدتے۔ جو لوگ پہن سکتے ہیں نہیں پہنتے۔ چونکہ ملکہ بھاری سے بھاری اور قیمتی سے قیمتی زیورات پہن سکتی تھی لیکن اس نے صرف ایک سیاہ موتیوں کا سٹ پہنا اس لیے سادگی کے لفظ کا اطلاق ہوا۔

جب معمولی نثر لکھنے والے اپنی مفلس اور کنگال نثر پر سادگی کا الزام لگاتے ہیں اور فن کا ڈھنڈھورا پیٹتے ہیں تو درحقیقت وہ اپنی ادبی غریبی اور عاجزی پر مہووم سادگی کا پردہ ڈالنے کی احمقانہ کوشش کرتے ہیں۔ پھر

برقعے، نفیس خوبصورت، کچھ کے نقاب لٹے ہوئے، کچھ کے نقاب گرے ہوئے۔ کچھ لڑکیاں بے برقع بھی تھیں۔ سب پڑتمکت، مکلف، نستعلیق۔ آج کی کچھ طالبات کی طرح ڈاکوؤں کے مانند ڈھائے باندھے ہوئے کوئی نہیں تھی۔

مجھے ہرگز نہیں معلوم تھا کہ استاد محتشم پروفیسر رشید احمد صدیقی مجھے ایم۔ اے کارجرسٹر عطا فرمائیں گے اور مومن پرنسپل پر لکچر دینا پڑے گا۔ جتنی دیر میں حاضری لی اتنی ہی دیر میں لکچر تیار کر لیا۔ ایکسٹمپورلکچر کو راہی سمیت تمام طالب علم اور طالبات مکمل خاموشی کے ساتھ سنتے رہے۔ گھنٹہ بجا، اسٹاف روم میں داخل ہوا تو دیکھا کہ میاں خاں استاد محتشم کی سیاہ شیروانی کی پشت پر لگا ہوا چونے کا دھبہ صاف کر رہے ہیں۔ یعنی پروفیسر نے دیوار سے لگ کر پورا لکچر سنا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی حکم ہوا۔

”میاں خاں ڈینڈی کی چائے پلاؤ۔ ڈینڈی کے طفیل میں مجھے بھی آدھی پیالی دو۔“ چائے میری ٹرائی تھی استاد محتشم کا ایک گردہ نکل چکا تھا۔ بغیر شکر اور دودھ کی آدھی پیالی چائے پینے کی رسم ادا کرتے تھے۔ پوری یونیورسٹی میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ صدر شعبہ اردو نے ایک نووارد لڑکے کو پہلا کلاس ایم۔ اے کا دے ڈالا۔ پروفیسر نے یہ بھی فرمایا تھا۔

”اپنی اولاد کے بعد جن نوجوانوں کو میں عزیز رکھتا ہوں ان میں ڈینڈی کا نام سر فہرست ہے۔“

جملہ معترضہ دوم

بورڈ آف اسٹڈیز کی پہلی میٹنگ کا روپہلا دن بھی یادداشت کے سنہرے صندوقچے میں ایک مرضیح یاد کی طرح رکھا ہے۔ ۲۰ دسمبر سے سما کی چھٹیاں شروع ہونے والی تھیں۔ ۱۹ دسمبر کو میٹنگ ہوئی۔ آج رشید صاحب پریس کی ہوئی عنایتی رنگ کی شیروانی سیاہ

کتاب ملیٹری اکادمی کے نصاب میں شامل نہیں ہے یہ شرف خدا نے صرف مجھے عطا فرمایا اس میں میرا کوئی شریک نہیں۔ کوئی حریف نہیں۔

جدید فلشن کی تاریخ میں پریم چند سے سید محمد اشرف تک کسی فلشن نگار نے ایک میدان جنگ بیان کرنے کی جسارت نہیں کی۔ خاکسار نے تقریباً ایک درجن میدان جنگ پیش کیے ہیں۔ اس صفت خاص میں میرا کوئی جواب نہیں، میرا کوئی مثل نہیں۔

جملہ معترضہ اول

لکچر رشپ کا پہلا دن حافظے میں سونے کے قلمے کی طرح جگمگا رہا ہے۔ دوسرے کئی شعبہ ہائے تعلیم کی طرح شعبہ اردو بھی سرسید ہال کیسپس میں تھا۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۵۵ء کی وہ ایک چمکدار صبح تھی۔ گیارہ بجے کا گھنٹا بجا تھا شعبہ اردو کے صدر پروفیسر رشید احمد صدیقی نے مجھے اپنے قریب بلا یا۔

”یہ ایم اے پر پریس کارجرسٹر ہے جو میں آپ کو دے رہا ہوں۔ جائے مومن خاں مومن پرنسپل پر لکچر دیجیے۔ پوری توجہ کے ساتھ خدا حافظ“

میرے ہاتھ کاٹنے لگے تھے۔ میں تھری پیس پہنے ہوئے تھا لیکن سردی سی لگنے لگی تھی۔ سیمینار کے پہلو کے کمرے کا نیلا پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہوا۔ اوسط درجے کے کمرے کے درمیان خاصہ اونچا پردہ لگا ہوا تھا۔ پردے کے ایک طرف طالب علم تھے اور دوسری طرف طالبات۔ میز تک پہنچتے پہنچتے طالب علم کھڑے ہو چکے تھے۔ سیاہ شیروانیاں چمک رہی تھیں کچھ طالب علم سوٹ اور مہینیشن بھی پہنے ہوئے تھے۔ موڈب، مہذب، پرسکوت، سب سے آگے راہی معصوم رضا تھے جو بی۔ اے پاس کرنے کے آٹھ دس سال بعد ایم۔ اے کرنے آئے تھے۔ اخلاق محمد خاں شہریار بھی تھے۔ جب تک میں کرسی پر بیٹھ نہیں گیا سب مجھوں کی طرح کھڑے رہے۔ پردے کے دوسری طرف طالبات کھڑی تھیں۔ سیاہ

کہتا ہوں صناعی کی دولت کے بغیر سادگی افلاس ہے۔ پرنسپل کا شکار کرنے والے شکاری کی طبیعت شیروں اور ہاتھیوں کے شکار کی طرف اس لیے مائل نہیں ہوتی کہ شیروں اور ہاتھیوں کے شکار کرنے والے اسلحے اور وسائل اس کی دسترس میں نہیں ہوتے۔ یہ خیال بھی غلط ہے کہ بہت سے لوگ میری طرح رنگین نثر لکھ رہے ہیں جو دوست بنانے کے ہنر سے قطعاً ناواقف اور دشمن بنانے کے فن میں بے مثال جس کی بات روکھی چال ٹیڑھی۔ فیض پہنچانے والے وسائل سے محروم اور نقصانات پہنچانے والی صلاحیت معدوم تادم تحریر میری زندگی اور آرٹ پر چالیس (۴۰) مضامین اور سات (۷) کتابیں شائع ہو چکی ہیں کسی ایک صاحب قلم نے دھوکے سے بھی ایک جملہ ایسا نہیں لکھا جس سے یہ شک پیدا ہو کہ میں نے کسی کے رنگ میں لکھا یا کسی نے میرے رنگ میں ایک صفحہ بھی مرقوم کیا ہے۔ اردو فلشن کی تاریخ میں کوئی ایک فلشن نگار ایسا نہیں پیدا ہوا جس نے تین اسالیب میں ناول لکھے ہوں۔ میں نے ایک اسٹائل میں شکست کی آواز، شب گزیدہ (مچھوہیا) غبار شب، بادل (بادل کو باقر مہدی نے علامتی ناولٹ لکھا ہے) آخری کہانی اور شب انتظار (زیر طبع) دوسرے اسٹائل میں غالب حضرت جان اور تاجم سلطان لکھے۔ اسلوب جلیل یعنی گرینڈ اسٹائل رزمیہ نثر کے جمال و جلال سے مالا مال صرف پروفیسر طارق سعید نے میرے اس اسٹائل کو سمجھا اور اسلوب جلیل کے نام سے پوری کتاب لکھ دی۔ اس گرینڈ اسٹائل میں ناول صلاح الدین ایوبی، داراشکوہ، خالد بن ولید لکھی گئیں۔ اردو تنقید نے جو تغافل برتا اس کی تلافی ہندوستان کی ملیٹری اکادمی نے کر دی۔ یعنی میری کتابیں اپنے نصاب میں شامل کر لیں۔ آزاد ہندوستان کی دوسری زبانوں کے بارے میں مجھے نہیں معلوم۔ لیکن اردو ہندی کے کسی فلشن نگار کی کوئی

محمل کی اونچی دیوار کی ٹوپی اور گول شیشوں والی کالی عینک پہنے میز کی صدر کرسی پر بیٹھے ہوئے۔ سامنے چیرز پر پورا اسٹاف موجود تھا۔ میں جذباتی صاحب کی بائیں ہاتھ کی کرسی پر ٹکا ہوا تھا۔ میرے پہلو کی کرسی خالی تھی۔ اچانک روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔ ایک خوبصورت خاتون سترے ہاڈر، گہرے سبز رنگ کی ریشمی ساری باندھے داخل ہوئیں۔ معلوم ہوا کسی فلم کی ہیروئن شوٹنگ چھوڑ کر کسی سے ملنے ڈپارٹمنٹ آگئی ہے۔ میں نے بے اختیار ہو کر جذباتی صاحب سے پوچھا۔ یہ کون ہیں؟ شاید کون نے سن لیا وہ میرے قریب آئیں، ذرا سانس ہوئیں اور کہا۔

”میں سلما صدیقی ہوں (پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب کی صاحبزادی) وہ بیٹنس کالج میں پڑھاتی ہوں“

میرے برابر کی کرسی پر بیٹھ گئی میرے سفید اور سرخ جوتے غور سے دیکھے، کان کے قریب منہ لاکر فرمایا ”یہ جوتے بازار میں تو ملتے نہیں۔ گھر میں بنائے ہوں گے۔ کتنی محنت کی ہوگی۔ چمڑے کو دودھ میں ابالا ہوگا۔ پھر چونا چڑھایا ہوگا پھر کھریا مٹی کا لیپ کیا ہوگا۔ اللہ قسم اگر آپ نے اتنی محنت ناول پر کی ہوتی تو شکست کی آواز کی جوڑی تیار ہوگئی ہوتی“

چیرا سیوں نے چھوٹی چھوٹی میزوں پر بسکٹ کی طشتریاں اور چائے کی پیالیاں رکھنا شروع کر دی تھیں۔ کان کے قریب اپنا غنچہ سا دہن لائیں، ”شیر وانی پر اتنی کریم اچھی نہیں لگتی۔ ڈینڈی صاحب یہ جوڑی دار کی چوڑیاں فیروز آباد سے منگوائی ہیں؟ دیکھئے اگر آپ روٹھے رہیں گے تو میں کہیں اور۔۔“

”نہیں نہیں آپ تشریف رکھیے“ میں نے جلدی سے کہا،

”اللہ! آپ کی آواز بھی جوتوں ہی کی طرح چمک دار ہے“

وہ میری ریگنگ کر رہی تھیں، جملوں کے پٹانے چھوڑ رہی تھیں۔ چاند ماری کر رہی تھیں۔ میں لکھنؤ یونیورسٹی کا مشہور گولڈ میڈلسٹ طالب علم، ٹاپر، ایک کتاب کا مصنف، ترقی پسندوں کے جریدے شاہراہ کے مدیر و امدت جوینیوری نے ۱۹۵۴ء کے سالنامے میں میری انقلابی نظم ’گومتی کی آواز‘ ایک صفحے کے ادارتی نوٹ کے ساتھ فراق گورکھپوری کی نظم سے پہلے شائع کی تھی۔ ہیوٹ ہوٹل میں گالیوں کے کمپینشن کا چمپئن (میں نے شیلڈ اٹھائی تھی) بالکل چپ تھا۔ کہ سلما آپا مجھ سے سینئر تھیں۔ خاتون تھیں، استاد محتشم پروفیسر رشید احمد صدیقی کی بیٹی تھیں۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ صدر نے میٹنگ کا آغاز کر دیا۔ سلما آپا سے اس دن دوستی کی جو بنیاد پڑی وہ تمام عمر قائم رہی۔ وہ اگر ممبئی سے تین دن کے لئے بھی آتیں تو اپنی آمد سے مجھے ضرور سرفراز کرتیں۔ جب کرشن چندر ان کے حسن و جمال کا ذکر ہونے اور علی گڑھ کے مسعود محل میں قیام کیا تو پہلی ہی شام سلما آپا اپنے کرشن کو لے کر غریب خانے پر تشریف لائی تھیں۔ میں نے شاہدہ (بیگم) سے قرض لے کر اسکاچ کی بوتل منگوائی تھی۔ شاہدہ اپنی دونوں ملازموں کے ساتھ جو وہ اپنی خدمت کے لئے اپنے گھر سے لائی تھیں کچن میں چلی گئی تھیں۔ میرے لاکھٹے کرنے کے باوجود شاہدہ کی مدد کرنے اٹھ گئی تھیں۔ سلما آپا۔ میرے شاگرد تنویر نیو اور میری اسٹوڈنٹ بلقیس جہاں موجود تھیں اور چھوٹی چھوٹی خدمتوں میں مصروف۔

سلما آپا کے کرشن لکھیا باتونی نہیں تھے لیکن اس دن بہت بول رہے تھے۔ ساری گفتگو نثر کے گرد گھومتی رہی۔ کرشن چندر کی نثر، منٹو کی نثر، عصمت کی نثر، دارا شکوہ کی نثر زیر بحث رہی۔ کرشن چندر پانچ بجے تشریف لائے تھے گیارہ بجے کھانا ہوا تھا رخصت ہوتے ہوتے بارہ بج گئے تھے رات کے۔ جب سلما

آپا اور کرشن چندر پاس پاس بیٹھے ہوئے تھے تو میں سوچتا سلما جیسی حسین و جمیل عورت کو کرشن چندر میں کیا نظر آ گیا جو ننھا اور ہوگیں۔ کہیں سے آواز آتی وہی نظر آیا ہوگا جو تاج سلطان کو تم میں نظر آیا تھا، قلم۔ قلم کی سلطانی سلطانی ہوتی ہے۔ باقی رہتی ہے۔ تمام سلطانیوں فنا ہو جاتی ہیں لیکن قلم کی سلطانی۔ آج نہ سلما آپا ہیں نہ کرشن چندر لیکن ان کے وجود سے چمکتی مہکتی چمکتی دکتی محفلیں باقی ہیں۔ ساری عمر محفلیں ہی تو سجاتے رہے، سجتے رہے۔ باقی سب کچھ تو کارزیاں تھاراینگاں، گنج رازینگاں۔

پس نوشت

میرزا جعفر حسین کے قلم زاوئے کھوئے ہوئے لکھنؤ کے تہذیبی لعل و جواہر ہیں۔ کتابوں کی کانیں کھودتے رہے، تلاش تے رہے، ان کی تاب سے اپنے جریدے کو تابدار کرتے رہے کہ اب دوسرا جعفر حسین پیدا نہیں ہوگا۔

رتن سنگھ کی کہانی رتن سنگھ کی کہانی ہے۔ خاصہ کی چیز ہے۔ پڑھیے اور سدھنیے۔ جناب سہیل وحید صاحب ستاسی سال کی عمر ہے۔ خیال آتا ہے کہ ممکن ہے یہ آخری تحریر ہو۔ تو مکمل ہی کر دوں۔ میں نے آج تک کسی استاد (بشمول استاد معظم پروفیسر مسعود حسن رضوی، استاد مکرم پروفیسر احتشام حسین، استاد محترم پروفیسر آل احمد سرور، استاد محتشم پروفیسر رشید احمد صدیقی) کو کوئی کتاب پیش نہیں کی کہ حضور اپنی قیمتی رائے سے نواز دیجئے۔ کسی نقاد کسی جریدے، کسی میگزین کسی رسالے کی خدمت میں کوئی کتاب پیش نہیں کی کہ تبصرے کی دولت سے مالا مال کر دیجیے۔ کسی انعامی یا ایوارڈ کمیٹی کو کوئی کتاب نہیں بھیجی کہ جنابا سے بھی پڑھ لیجیے اس لئے کہ مجھے معلوم ہے کہ اردو دنیا میں جہاں بھی اردو نثری ادب پڑھا جاتا ہے میری تحریریں پڑھی جاتی ہیں۔

□□□



مشرف عالم ذوقی

ڈی ۳۰۳، تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی
موبائل: 9899583881

اسموگ، ادبی افق اور گم ہونے پرندے

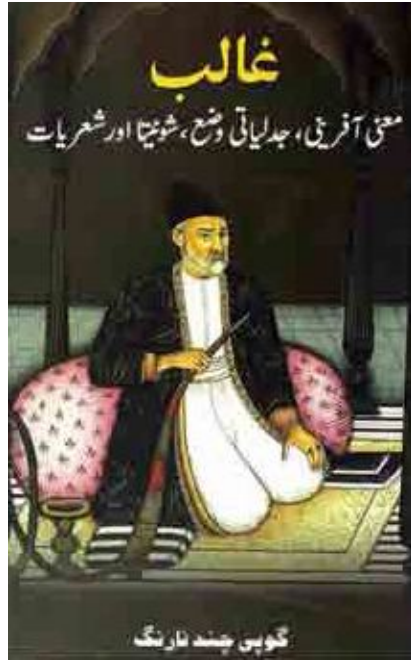
For Last Year's Words Belong to last Year's language, and next Year's Words await another Voice.

T.S. Eliot

2017 کے ادبی افق کا جائزہ لینا چاہتا ہوں تو کچھ شاہکار کہانیوں کے مختصر مختصر مکالمے موسیقی بن کر کانوں میں گونجنے لگتے ہیں۔ ایک فوجی نے ایک معصوم سی بچی سے دریافت کیا، جب ہماری یہ چھوٹی سی دنیا آگ اور دھوئیں سے کھیل رہی تھی، اس وقت تم کیا کر رہی تھیں؟ ننھی بچی کا جواب تھا۔ میں اپنے لئے ریشمی اون سے دستا نے بن رہی تھی۔ ایک دانشور نے ایک چھوٹے سے بچے کو روک کر پوچھا۔ سڑک کے اس طرف عظیم الشان عمارتیں ہیں اور دوسری طرف غربت و افلاس کا ملبہ، تم کیا کرو گے؟ کہاں جاؤ گے؟ بچے نے چلتے چلتے جواب دیا..... فی الحال میں اپنا سفر جاری رکھنا چاہتا ہوں۔

بلاکت، خون ریزی، جنگ عظیم کی وحشتوں کے درمیان بھی انسانی سفر ختم نہیں ہوتا، جیسا کہ اس بچے کا جواب تھا۔ سفر جاری رہتا ہے۔ ہر نیا دن ہماری زندگی کی عمر سے ایک دن چھین لیتا ہے مگر سفر ختم نہیں ہوتا۔ ہم چلتے جاتے ہیں اور یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ اسموگ اور دھول کی چادر میں لپیٹی ہوئی زہریلی گیس تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہی ہے، یہ ہماری اس نئی دنیا کا سچ ہے، جہاں تمام تر اقدامات کے باوجود ماحولیات کے تحفظ میں ہم ناکام رہے ہیں۔ ایک ایسی

دنیا اور سیاسی نظام سامنے ہے جہاں پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے خوفناک اثرات کو دیکھتے ہوئے کتنی ہی امن پسند تنظیموں کو یہ ذمہ داری دی گئی کہ تیسری جنگ عظیم کی صورتحال کو پیدا ہونے سے روکا جاسکے۔ آج انسانی حقوق و تحفظ سے وابستہ تنظیمیں لاچار ہیں اور ہم آہستہ آہستہ جنگی کھرے کے خدشے میں گھرتے جا رہے ہیں۔ غور کریں تو تانا شاہوں کے حرم سے باہر



نکل کر میزائلوں کی یلغار کی جا رہی ہے۔ انسانی حقوق کی تنظیمیں بھی اس بات سے واقف ہیں کہ عالمی سیاست پر آہستہ آہستہ جنگ عظیم کے خطرات منڈلانے لگے ہیں۔ جواب لکھا جا رہا ہے / وہ اسی کھرے سے برآمد ہوا ہے۔

جو لفظ ابھی وجود میں نہیں آیا / وہ اسی اسموگ سے عالم وجود میں آئے گا۔

سوچنا ضروری ہے کہ یہ خوفناک وحشتیں، ہمیں کہاں لے کر آگئی ہیں اور اس کا انجام کیا ہوگا؟ سال کے آخری دنوں میں، ایک پورے برس کے ادب کا احاطہ کرنے بیٹھا ہوں تو ساحر کی نظم پر چھانیاں مجھے گھیر لیتی ہے۔ نئی صدی کے 17 برسوں میں ایک دنیا تبدیل ہو چکی ہے۔ سیاست، ثقافت، مذہب، معاشرہ، مرد اور عورت کے تعلقات، نوجوانوں کے مشغلے، بچوں کے مزاج غرض کہ ہر جگہ بڑی تبدیلیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان کے اثرات ادب پر بھی مرتب ہوئے۔ اردو افسانوں کی عالمی بستی بھی موجودہ عالمی فضا سے متاثر نظر آتی ہے۔ ہندوستان کے ادبی ماحول کے تذکرہ سے قبل سیاسی و سماجی تبدیلیوں پر مختصر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ ملک کی معیشت میں غیر معمولی تبدیلی آئی۔ عدم برداشت اور عدم تحمل پر بحثیں ہوئیں۔ ملک کے ادیب دو حصوں میں تقسیم نظر آئے۔ سیاست کی اس روشنی سے اردو گھر کے ادبی کمرے گلزار نہیں تھے۔ 2018 کا خیر مقدم کرتے ہوئے اور 2017 کو الوداع کہتے ہوئے یہ سوال ضروری ہو جاتا ہے کہ کیا یہ وہی نہ ختم ہونے والی اداسی ہے جس نے پچھلے ستر برسوں سے اردو دانشوروں کو سیاسی فضا سے دور رکھا ہے؟ قدرت کا ستم ہے کہ اس مخلوق کے پاس نہ بغاوت ہے نہ احتجاج۔ اردو ادیبوں کے سرد ترین رویوں نے اردو کو بڑے عالمی بازار سے دور رکھا ہے اور اسی لئے مستنصر حسین

جشن ریختہ کی دھوم پوری دنیا میں رہی ہے۔ ریختہ کے ساتھ اب جشن اردو نے بھی پچھلے دو برسوں سے اردو والوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ ان دونوں نے سوشل میڈیا پر اپنی

خاص جگہ بنالی ہے۔ اردو زبان اب پرنٹ میڈیا سے نکل کر سوشل ویب سائٹس کو فتح کر رہی ہے۔ یہ زمانہ ویسے بھی سوشل میڈیا اور ای بکس کا ہے۔ 'جشن ادب، پورٹل اس سال اردو ادب سے متعلق خاصی سرگرم رہا، خاص کر



ادبی شعریات سے متعلق اس پورٹل نے کافی مواد کی نشر و اشاعت کی۔

'اردو چینل' نے سوشل میڈیا پر اردو ادب کے حوالے سے اپنی فعالیت برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ

مشاہیر کی توجہ بھی اپنی جانب مرکوز کر لی ہے خاص طور پر غیر ملکی زبانوں اور لوک کہانیوں کے ترجموں سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ واٹس اپ کے ذریعہ مستفید ہو رہے ہیں۔ قمر

پرورش پاتی ہیں۔ ریختہ نے پوری دنیا کے ان لوگوں کی اس تلاش کو پورا کر دیا جو جنوبی ایشیا کے اردو ادب سے جڑی ہوئی تھی۔ اردو ادب کے تعلق سے اس کی

تصویراتی پہنچ فی الوقت سب پر بھاری ہے۔ وہ لوگ جو اردو رسم خط سے واقف نہیں ہیں لیکن اردو کے مداح ہیں، ان کی ادبی تشنگی کو بھی ریختہ ایک حد تک دور کر رہا ہے۔

تارڑ اور شمس الرحمن فاروقی کی کتابیں اگر مین بکر انعامات کی فہرست میں شامل بھی ہوتی ہیں تو انعام کی مستحق نہیں سمجھی جاتیں۔ ایوارڈ کمیٹی میں بیٹھے ہوئے

مبصرین برصغیر کی قدیم تاریخ اور موجودہ سیاسی پس منظر میں جو موضوعات دیکھنا چاہتے ہیں وہ انہیں اردو نہتی رائے، اور ہان پاک، جارج سائڈرس، ناپال، کرن دیسائی کے یہاں آسانی سے مل جاتا ہے لیکن اردو والوں کے یہاں ان موضوعات کا فقدان اور مارکیٹنگ کی کمی بھی نظر آتی

ہے۔ قرۃ العین حیدر کے 'آگ کا دریا'، مستنصر حسین تارڑ کے 'دخس و خاشاک زمانے'، رضیہ فصیح احمد کے ناول 'صدیوں کی زنجیر' اگر عمدہ انگریزی ترجمے کے ساتھ شائع ہوتے تو ممکن ہے انعام کے حقدار ثابت

ہوتے۔ قرۃ العین حیدر نے 'آگ کا دریا' کا ترجمہ خود ہی کیا تھا، کچھ ان کا تعصب، کچھ ہماری کمی۔

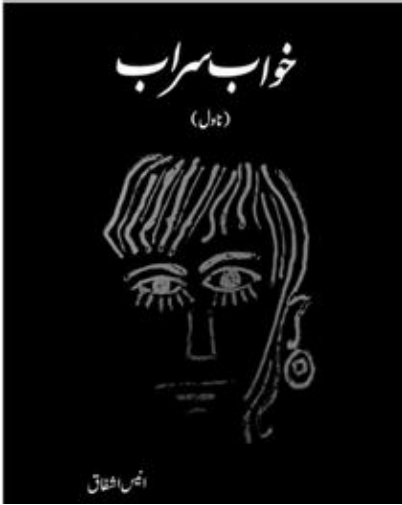
2017 میں اردو کی رنگا رنگ دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو جشن کا ماحول نظر آتا ہے۔ ریختہ آن لائن اردو کتابوں کے مطالعہ کے لئے عالمی اردو



صدیقی کی یہ خدمات قابل ستائش ہیں۔ اسی کے ساتھ اعجاز عبید کی بزم اردو لائبریری کے ساتھ آج زیادہ تر اردو رسائل ویب سائٹس پر اپنی چمک دکھا رہے ہیں۔ مہر افروز، بین علی، قاسم یعقوب، ابرار مجیب نے سوشل میڈیا پر اردو کو فروغ دینے میں نمایاں

جشن ریختہ بھی اپنے آپ میں ایک نمایاں حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ اردو ادب کی تمام معروف و مقبول شخصیتوں کی اس جشن میں آمد اور اس کی ڈیجیٹل پہنچ نے اردو ادب کے ٹھنڈے ہوتے جا رہے بازار کو گرمی بخش دی ہے۔

بستی کا سب سے بڑا بازار بن چکا ہے۔ پوری دنیا میں خصوصی طور پر ہندوستان کے اردو ادب تک آن لائن رسائی کرانے والے اس پورٹل کے شائقین کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ rekhta.org اس مقام پر پہنچ گیا ہے جہاں سے ادب کے شیدائیوں کی نسلیں

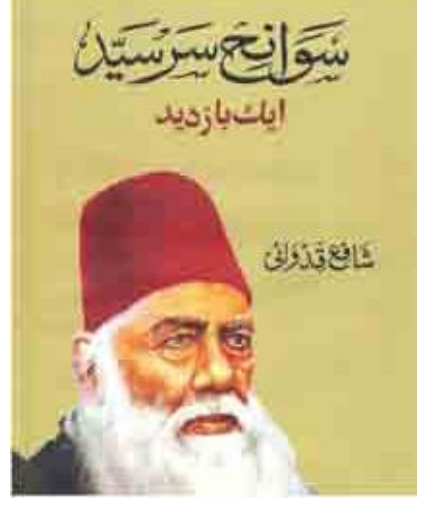


۲۰۱۷ء میں بہار اردو اکادمی نے ہندوستان کی تخلیق کار خواتین کو اکادمی کا بڑا پلیٹ فارم دیا۔ خواتین کی آواز گونجی تو یہ بات شدت سے محسوس کی گئی کہ ان کا اپنا ایک منہ ہونا چاہئے۔ بنات کے نام سے خواتین قلم کاروں کی تنظیم سامنے آئی۔ جلسہ گاہ کے باہر شمول احمد کے افسانے دلگتی، پرواویلا چا اور بات اس حد تک بڑھی کہ وبال جان بن گئی۔

دہلی تو ہمیشہ ہی ادبی اور فنون لطیفہ کی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے لیکن اب لکھنؤ بھی اپنی ادبی سرگرمیوں کیلئے گزشتہ چند برسوں میں نمایاں مقام حاصل کر چکا ہے۔ ہر سال چار پانچ کتابی میلوں کے علاوہ چار پانچ لٹ فیسٹ بھی پابندی سے منعقد ہونے لگے ہیں جن میں مشہور ادبی شخصیتوں کی آمد کا ایک سلسلہ بن چکا ہے۔

نمبر اور غزل نمبر شائع کر کے اردو کتابوں کو امیزن اور فلپ کارڈ سے جوڑنے کا نیا سلسلہ شروع کیا۔ دسترس، امروز، ادب سلسلہ، اردو چینل، تنہیم، استفسار کی اشاعت نے معیاری رسائل کی فہرست میں اضافہ کیا۔ کونسل، اردو ادارے اور اردو یونیورسٹیاں اردو کے پروگرام سال بھر کرتی رہتی ہیں۔ ایسے تمام پروگرام پر کچھ پروفیسر حضرات کا قبضہ برقرار ہے۔ ان کا ایک کا کس پہلے سے عمل پیرا ہے۔ اس کی سرگرمی کبھی ختم نہیں ہوتی اسی لئے ان پروگراموں میں سال بھر یہی پروفیسر حضرات نظر آتے ہیں۔

اردو ادب کے ابلاغ و ترسیل کا جو سب سے بڑا ذریعہ بن کر ابھرا ہے وہ ہے واٹس اپ گروپ۔ دہلی، ممبئی، کلکتہ اور لکھنؤ جیسے شہروں میں وسائل کی کمی نہیں ہے لیکن پورا ہندوستان ان شہروں میں نہیں بستا، چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں ادبی سرگرمیوں کو واٹس اپ گروپ نے ایک جامع پلیٹ فارم مہیا کر دیا ہے۔ واٹس اپ گروپ نے چھوٹے شہروں کی ادبی سرگرمیوں کو آفاقیت یوں بخشی ہے کہ انہیں عالمی سطح پر ڈیجیٹل سسٹم کے تحت پذیرائی حاصل ہو رہی ہے۔ ان میں سے ہزاروں واٹس اپ گروپ ایسے ہیں جن پر باقاعدہ طرحی نشستیں منعقد کی جا رہی ہیں جن میں یورپ، امریکہ سے لے کر درجہ نگلہ اور لکھنؤ پور تک کے شعراء شرکت کرتے ہیں۔



کام کیا ہے۔ اس برس پہلی کنیشنز ڈیویژن کی میگزین آج کل نے 75 برس پورے کئے۔ ڈاکٹمنڈ جلی کی تقریبات دھوم دھام سے منائی گئی۔ پرانی دہلی سے نکلنے والے رسالہ 'دین دنیا' نے 96 سال پورے کئے۔ مالی دشواریوں کے باوجود اعظم گڑھ کے دارالمصنفین سے نکلنے والا رسالہ 'معارف' نے سو سال پورے کئے۔ دہلی سے رہنمائے تعلیم 113 برسوں سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ لکھنؤ سے محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ کا رسالہ 'نیادور' کی ادارت جب سہیل وحید کے ہاتھوں میں آئی تو اس کی دھوم مچ گئی۔ واٹس اپ، فیس بک اور سوشل میڈیا پراس نے ہزاروں قاری پیدا کئے۔ یہ بھی انکشاف ہوا کہ اس کی اشاعت کو بھی 95 سال ہو چکے ہیں۔ منصور خوشتر نے درجہ نگلہ ٹائٹس کے لگا تار تین خصوصی نمبر افسانہ نمبر، ناول





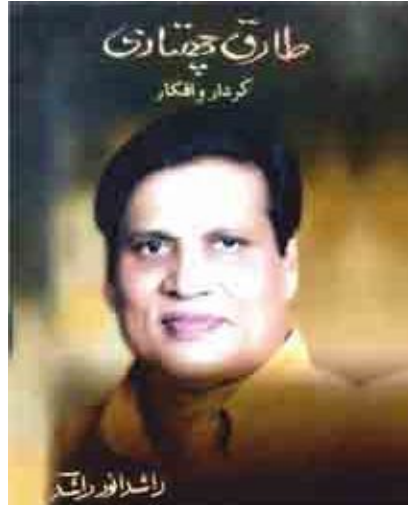
کچھ، رشید حسن، محقق و مدون کے عنوان پر، ٹی آر ریانا، جموں کشمیر کا کچھ، علامہ اختر علی تلہری، احوال و آثار پر ڈاکٹر خالد حسین کا کچھ نیز رامپور رضا لائبریری میں محفوظ اسلامی خطاطی کے نمونوں کی نمائش کی گئی۔ شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی کے زیر اہتمام ڈاکٹر تارا چند میموریل کچھ کا انعقاد کیا گیا اور اسی یونیورسٹی میں پنڈت برج نرائن چکبست حیات و کمالات پر سیمینار منعقد کیا گیا۔

اکتوبر کے آخر میں مالے گاؤں میں اردو کتب میلہ میں صرف تین دنوں میں 22 لاکھ سے زیادہ کی اردو کتابیں فروخت ہوئیں۔ اردو کو مردہ تصور کرنے والوں اور قاری کے نہ ہونے کا الزام لگانے والوں کو مالے گاؤں نے یہ پیغام دیا ہے کہ اردو بھی زندہ ہے اور قاری بھی۔

ادب کی نئی آوازوں میں گم گشتہ تاریخ کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔ غور کریں تو ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں، جسے سمجھنے کے لئے ہمارے ادیب اور دانشور قدیم تاریخ کے بکھرے ہوئے صفحات کا تعاقب کرتے ہیں تو وہاں بھی سماجی، سیاسی، ثقافتی، معاشرتی ڈھانچے میں وہی عکس نظر آتا ہے، جس کی دھند ان دنوں ہماری نئی دنیا پر دکھی جاسکتی ہے۔ جارج سائڈرس کو 2017 کا مین بکر ایوارڈ ملا۔ اس کے ناول لکٹن ان دی بارڈو میں امریکی صدر ابراہیم لنکن اپنے بیٹے سے ملنے شب کی تاریکی میں شہر خوشاں میں

بنارس ہندو یونیورسٹی میں رضا لائبریری کے اشتراک سے غالب کی فارسی مثنوی 'چراغ دیر پر فلماکی گئی ڈاکیومنٹری فلم بعنوان "کعبہ ہندوستان" کی نمائش کی گئی۔ رامپور رضا لائبریری اس سال اپنی ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے سرخیوں میں رہی، رضا لائبریری میں پریم چند کی 137 ویں یوم پیدائش پر دو روزہ قومی سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ رضا لائبریری اور صولت لائبریری کے اشتراک سے 'یوم صحافت' منایا گیا۔

معروف محقق و نقاد پروفیسر نثار احمد فاروقی کی اردو، فارسی اور عربی خدمات پر بھی ایک پروگرام کیا گیا۔ 'تاریخ فیروز شاہی' پر کچھ کے علاوہ داغ دہلوی اور رامپور کے عنوان پر پروفیسر علی احمد قاسمی کا کچھ، سنسکرت متون کے فارسی تراجم پر پروفیسر شریف حسین قاسمی، دہلی کا



حال ہی میں منعقد لٹ فیست میں معروف شاعر فرحت احساس اور ارشاد کامل نے شرکت کی۔

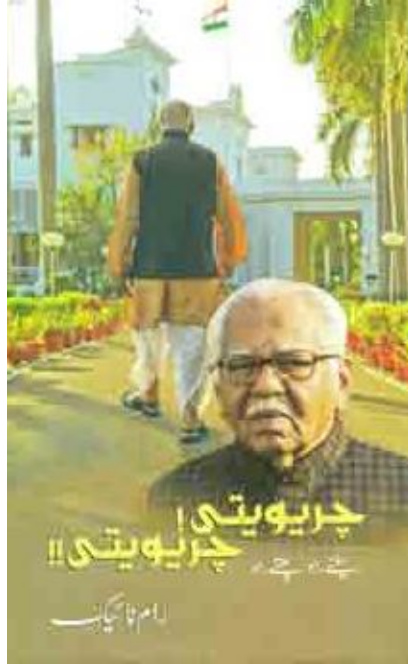
لکھنؤ کا راج بھون بھی پورے سال اردو کی ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے سرخیوں میں رہا۔ درجن بھر سے زائد ادبی پروگرام راج بھون میں منعقد ہوئے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب عزت مآب گورنر جناب رام نائیک کی اردو نوازی کے بغیر ممکن نہیں تھا۔

ایک زمانے میں ہندی اردو ایوارڈ کمیٹی کے سالانہ جلسے تک محدود رہنے والے ادبی ماحول میں لکھنؤ کے اردو رائٹرز فورم نے جان پھونک دی۔ یہ فورم ہر سال کی طرح اس سال بھی کافی سرگرم اور فعال رہا۔ او۔ طابہر مہینے دو پروگرام کئے، جس میں کچھ انٹرنیشنل پروگرام بھی منعقد ہوئے۔ عارف نقوی (برلن) کی کتاب "طائر آوارہ" کی رونمائی ہوئی۔ انٹرنیشنل مرثیہ پر سیمینار میں ڈاکٹر لتیف علی عابدی (کینیڈا) خواجہ اکرام، کامنا پرساد وغیرہ کی شرکت کے علاوہ مسرور جہاں پر بھی ایک پروگرام افسانے سے متعلق کیا گیا۔

ہندی اردو بورڈ کمیٹی کی جانب سے نفاذی پر سیمینار ہوا۔ نیر مسعود کی رحلت پر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی میں تعزیتی جلسہ میں شمس الرحمن فاروقی اور علامہ عقیل الغروی (لندن) شریک ہوئے۔ پروفیسر شارب روولوی نے شمیم کہت کی یاد میں افسانہ کے موضوع میں ایک تقریب کا انعقاد کیا۔

ہر سال وافر مقدار میں اردو ادب سے متعلق کتابوں کی اشاعت کے جواز پر بحث فصول ہے۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی بنا کسی محرومی و مایوسی کے کتابوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا جن میں کچھ بیحد کارآمد کتابیں بھی شامل ہیں۔ اودھ کی تاریخ سے کشید کیا ہوا لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت پر مبنی پروفیسر انیس اشفاق کا ناول 'خواب سراپا' اس سال کی نمایاں کتاب ہے۔

ہندوستانی شاعرات (نجمہ رحمانی)، آہٹ پانچویں موسم کی (غزلیں) عباس رضا نیر، برگد (افسانے) جاوید انور، منزه احتشام (آئینہ گر، افسانے)، قمر مہز واری (افسانے) شاد عارفی حیات و جہات (فیروز مظفر، تنقید) بات کہی نہیں گئی (سببیں کرن، افسانے) نیا افسانہ نئے نام (نور الحسنین، تنقید) اماوس میں خواب (حسین الحق، ناول) تصریحات (رفیق الاسلام، تحقیق و تنقید) فلشن، تجزیہ اور موہوم حقیقت (انوار الحق، تنقید)، اردو افسانہ۔ مزاج و منہاج (محمد سلیم سالک، تنقید) تخم خوں (ناول، صغیر رحمانی) دائرہ (افسانوی مجموعہ صغیر رحمانی)، حیات غامدی (شاہ عمران حسین، تاریخی مطالعہ) منٹو کے نادر خطوط (فاروق اعظم قاسمی، تحقیق)، بہجان (ناول: فاروق مغل)، یہ راستہ کوئی اور ہے (ناول،



کی سوانح میں مستند مواد کا اضافہ کیا۔

ادبیات (اسلام آباد) اور عالمی اردو ادب (نند کشور و کرم) نے انظار حسین پر مفصل کتاب شائع کی۔ کلیات احسن سلیم، تصویر سخن، کلیات ثروت حسین نے اردو قاری کو متوجہ کیا۔ رابعہ نے الہ آباد اور افسانہ عہد حاضر میں دو حصوں میں شائع کیا۔ اسے ہم اردو افسانے کا انسائیکلو پیڈیا کہہ سکتے ہیں۔ لوح (ممتاز شیخ) نے اردو افسانے کے 117 برسوں کا انتخاب شائع کیا۔ اس میں 167 اہم افسانہ نگاروں کی نگارشات شامل ہیں۔

داخل ہوتا ہے تو جنگ عظیم اور بے گناہ انسانوں کی ہلاکت پر مشتمل ایک آسپی دنیا کے دروازے اس کے سامنے کھل جاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ تاریخ اپنے لامتناہی اور وسیع تر بلیک ہول کا ذرا سا پردہ ہٹا کر نئی دنیا کے انسانوں سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ 2017 کے نوبل انعام یافتہ جاپانی نژاد کا زو واشی گورو اپنے ناول 'مجھے کبھی جانے نہ دینا' میں جنگل کی پراسرار وادیوں کا تعاقب کرتے ہیں تو وسیع تر تاریخ کا مشاہدہ جنگل کو موجودہ تہذیب سے قدیم تہذیب کی طرف لے جاتا ہے جہاں کا زو واشی گورو ایک عمدہ داستان گو کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اردو فلشن نے داستان اور حکایتوں سے اپنا رشتہ کبھی منقطع نہیں کیا۔ یہ داستانیں رنگ بدل بدل کر ہماری کہانیوں کا حصہ رہی ہیں۔ 2017 کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی شہرہ آفاق کتاب کا انگریزی ترجمہ 'غالب' کے نام سے سامنے آیا۔ اشاعت کے فوراً بعد اس کتاب کی بین الاقوامی بازار میں دھوم مچ گئی۔ مولانا رومی کے ساتھ غالب بھی عالمی بازار کیلئے ایک بڑا برانڈ بن چکے ہیں۔ دور حاضر میں اردو تنقید و دانشوری کی نمایاں شخصیت پروفیسر شافع قدوائی کی کتاب 'سوانح سرسید' ایک باز دید بھی خاصی مقبول ہوئی۔ شافع قدوائی کی یہ کتاب پہلے انگریزی میں آکر مقبول عام ہو چکی ہے۔ اس کتاب نے سرسید



۲۰۱۷ء: نئی نسل کی تلاش

باہر آنا بھی ضروری ہے۔ پرانے دن اب واپس نہیں آسکتے۔ مایوسی اس مسئلے کا حل نہیں۔ کوشش اس بات کی ہونی چاہئے کہ نئی دنیا کی سوغات کو سانسے رکھتے ہوئے، جوٹی وی، موبائل، انٹرنٹ، لپ ٹاپ کے طور پر بچوں سے بزرگوں تک کو حاصل ہے، وہ جگہ کیسے تلاش کی جائے، جہاں کتابوں کی بھی حکومت ہو۔ یہ عمل انفرادی کوشش سے کامیاب نہیں ہوگا۔ اردو اداروں کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ایوانِ غالب، اردو گھر، مولانا ابوالکلام آزاد اردو اوپن یونیورسٹی، رضا لائبریری، خدا بخش لائبریری جیسے سرکردہ اداروں کے سالانہ بجٹ اور اسی تناسب میں ان کی سالانہ سرگرمیوں پر بحث مباحثے نہ جانے کیوں نہیں ہوتے اور اردو اکادمیوں کے حال زار پر بھی کوئی گفتگو کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔



ابھی زیادہ دن نہیں گزرے، بھینڈی کتب میلے میں ایک کروڑ سے بھی زیادہ قیمت کی کتابیں فروخت ہوئیں۔ مالے گاؤں میں اردو کے نام پر جلوس نکالے گئے۔ ہر جگہ اردو سے محبت کرنے والوں کا جوش و خروش دیکھنے لائق رہا۔ جو احباب اردو کا مرثیہ پڑھ رہے تھے، ان کے کلیجے کو ٹھنڈک ملی کہ اردو زندہ ہے۔ اردو سے کون محبت نہیں کرتا۔ جو محبت نہیں کرتے، وہ بھی سیاست کی رسم نبھانے کے لئے اردو بولنے پر مجبور ہیں۔ لیکن یہ سلسلہ صرف مالے گاؤں اور بھینڈی تک محدود نہیں رہنا چاہئے۔

اردو تنقید کی بات کریں تو یہ سوال لازمی ہو جاتا ہے کہ شمس الرحمن فاروقی، گوپنی چند نارنگ، شمیم حنفی کے بعد کی نسل کہاں ہے؟ ابوالکلام تقاسمی سے مولانا بخش تک

ہندوستان بیچنگ نہیں ہے نہیں، جہاں کسی لائبریری میں جانے کے لئے لمبی قطار لگتی ہو۔ ابھی یہ کتاب کلچر ہندوستان میں عام نہیں ہے۔ نئی اور تیز رفتار دنیا میں اس کلچر کو زندہ رکھنے کے لئے کوششیں کی جارہی ہیں۔ ٹی وی، موبائل، انٹرنٹ، لپ ٹاپ۔ تہذیب نے ہمارے یہاں سب سے زیادہ نقصان مطالعہ کے ذوق کو پچھاپا ہے۔ کتابیں تیزی سے گھروں سے غائب ہونے لگیں، ٹی وی چینلز نے وہ وقت اپنے نام کر لیا، جو روزمرہ میں ہم کتابوں کو دیا کرتے تھے۔ گھر کی عورتیں گھریلو کام کاج سے فارغ

ہو کر کتابوں میں زندگی بسر کیا کرتی تھیں۔ ایک وہ بھی زمانہ تھا، جب ہر گھر میں کھلونا، پیامِ تعلیم، نور، ثانی، خاتونِ مشرق، جرائم، شمع، روبی، مجرم، تہذیبِ نسواں جیسے رسائل پڑھے جاتے تھے۔ ہما، ہدلی، شبستان جیسے رسائل کی دھوم تھی۔ ابنِ صفی سے اکرم اللہ بادی، جاسوسی ڈائجسٹ لائبریری سے حاصل کیے جاتے تھے۔ محلے میں چھوٹی چھوٹی لائبریریاں ہوتی تھیں۔ رومانی ناولوں کی بھی دھوم تھی۔ خالی وقت میں اسی کتاب کلچر کا سہارا تھا۔ آج یہ تہذیبِ ماضی کی داستان بن چکی ہے۔ اب ہر شخص کے ہاتھوں میں موبائل ہے اور اس پر فراہم ہو رہا مواد گھر گھر کی ضرورت بن چکا ہے۔ بچوں اور نوجوانوں کے شوق بدل چکے ہیں۔ باہر دھند کی چادر پھیلی ہے لیکن اس دھند سے

اقبال حسن خاں)، بے رنگ پینا (ناول: امجد جاوید)، عین سر پہ ستارہ (نظمیں: افتخار جاوید)، اینکر (ناول: وقاص عزیز)، دکھ دان (ناول: اسلام اعظمی)، جرس (برقی مجلہ: محمد زبیر مظہر پٹوار)، نچ صاحب (ناول: اشرف شاد) کھویا ہوا جزیرہ (افسانے: عبدالقیوم خالد) بھائی گیٹ کاروبن گھوش (افسانے: امین بھائی) اور جہان گمشدہ (افسانے: گلہت سلیم)، جدید ہندی شاعری (ترتیب و انتخاب: اشاعت ثانیہ: خورشید اکرم) سفر جاری ہے (خاکے، مقالے، مکالمے: کیول دھیر) دھم (افسانہ: بیگ احساس) شریک حرف (شعری مجموعہ: خالد جمال)

خواب پلکوں پر (شعری مجموعہ: وشال کھلر) چریوتی، چریوتی (عزمتاب گورنر رام ناتک) ٹنڈے کباب (مزاحیہ: محبوب حسن) تصوف اور بھگتی، تنقیدی و تقابلی مطالعہ (شمیم طارق) شیخ مہدی حسین ناصر، ایک فراموش صاحب کمال (مصنف: ڈاکٹر فاضل احسن ہاشمی) نیلا چاند محاوروں کا استعمال (مصنف: سہیل کاکوروی) چوپال شعری مجموعہ: رئیس انصاری) گنگا جمن کے ساحل پر طارق قمر (مولف: طارق قمر) ادبی رسالہ ہماری آواز ششماہی میرٹھ، (مدیر اسلم جشید پوری) نے انتظار حسین پر خصوصی گوشہ شائع کیا۔

کتابیں تو بہت ہیں۔ اردو کی عالمی بستی سے میں نے کچھ ہی نام لئے ہیں۔ اب برقی مجلے بھی شائع ہو رہے ہیں۔ نند کشور و کرم پابندی سے عالمی ادب کا انتخاب ہر برس شائع کرتے ہیں۔ جرس، دیدبان جیسے برقی مجلے نئے امکانات کی طرف اشارہ کرتے ہیں، یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اردو مری نہیں زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔

بلراج میں راجے گئے۔ بلراج منیرا ہمارے قبیلے کے تھے۔ افسانے لکھتے تھے۔ انکے کئی افسانوں کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ آتمارام اور ماچس کا ذکر خصوصی طور پر ہوا۔ پھر وہ گھرے سٹائے کے قیدی بن گئے۔ لوگوں سے ملنا ملا نام ہو گیا۔ قمر احسن بہت بڑے افسانہ نگار تھے۔ انکے ساتھ بھی یہی ہوا۔ آج وہ کہاں ہیں شاید یہ علم بھی کسی کو نہ ہو، جسمانی طور پر منیرا ہمارے درمیان ضرور تھے، لیکن ادبی دنیا سے وہ اپنے تمام رشتے ختم کر چکے تھے۔ کبھی کبھی سننے میں آتا، کہ کسی نے بلراج منیرا سے ملاقات کی۔ کبھی کبھی منیرا کے تعلق سے کوئی اڑتی پڑتی بات بھی سامنے آ جاتی، وہ اردو افسانے کے مستقبل سے ناخوش تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ بیس سے پچیس برس میں انہوں نے کسی کا کوئی افسانہ پڑھا تھا یا نہیں۔ لیکن وہ خوش نہیں تھے۔ کیا وہ اختلاف کی حد تک اردو افسانوں سے مایوس ہو چکے تھے؟ یا وہ بھیا تک سطح پر ڈپریشن کا شکار تھے؟ اگر ایسا ہے تو کس بات کا ڈپریشن تھا؟ قمر احسن بھی اسی ڈپریشن کا شکار ہوئے۔ بلراج اس معاملے میں خوش قسمت تھے کہ قاری اور نقادوں نے انہیں مرنے نہیں دیا۔ جبکہ قمر احسن جیسے قدار افسانہ نگار کو بھولے ہوئے زمانہ ہو چکا ہے۔ بلراج منیرا کو خوش ہونا چاہئے تھا کہ کم لکھنے کے باوجود اردو سے پیار کرنے والوں نے انہیں اس صف میں قبول کر لیا تھا جہاں افسانوں کی نمائندگی کرنے والے چند نام ہی ہیں۔ اس مختصر فہرست میں آنکھیں بند کر کے انکے دو ایک افسانوں کا تذکرہ ناگزیر ہو گیا تھا۔ پھر کیا تھا کہ وہ افسانوں کی دنیا سے نکل کر لمبے بن واس پر چلے گئے؟ اور ایسے گئے کہ واپس نہیں لوٹے۔

بلراج منیرا کی ہر تحریر مختلف تھی۔ انداز مختلف تھا۔ زندگی کو دیکھنے کا فلسفہ مختلف تھا۔ آتش زریبا، ایک



بانو قدسیہ

کے باوجود ادب کا کاروبار جاری ہے۔ بادہ کش اٹھتے جاتے ہیں لیکن زندگی کا سفر جاری رہتا ہے۔ ان میں کچھ ایسے نام ہیں جنہیں



نیر مسعود

خراج عقیدت پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ نیر مسعود کی موت ایک قصہ گو کی موت ہے۔ رے خاندان کے آثار اور سیما جیسی کہانیوں کے خالق نے فکشن کے میدان میں قدم رکھا تو فکشن کی قدیم روایات، اصولوں، پیمانوں کی جگہ اپنی علیحدہ روش اختیار کی۔ ان کی کہانیوں کی پراسرار فضا پر طلسمی حقیقت نگاری کا رنگ غالب تھا۔ لیکن یہ ان کا مخصوص رنگ تھا۔ وہ نہ کھلتے تھے نہ ماجرہ کو کھولنے پر یقین رکھتے تھے۔ انسانی ذات کے طلسم ہوشربا میں داخل ہو کر وہ چپکے سے کچھ کردار تراش لیتے تھے۔ کچھ واقعات گڑھ لیتے تھے اور پھر کہانی ایسی جگہ اختتام پذیر ہوتی کہ قاری کے پاس نہ چوکنے کیلئے کچھ ہوتا نہ جذباتی بننے کیلئے۔ کبھی کبھی عام قاری مکمل کہانی کے طلسم میں جکڑا ہوا، اختتام پر آ کر خود کو گھٹکا ہوا محسوس کرتا۔ نیر مسعود کی اسی انفرادیت نے ان کو عظیم فکشن نگاروں میں شامل کیا کیونکہ فکشن نگار کا کام نہ بیٹانے بھرانے نہ کہ چھلکانا۔ نیر مسعود زندگی کے رموز و اسرار سے ایک بھید بھری ادھوری کہانی اپنے قاری کے سامنے رکھ دیتے۔ گو یا وہ یہ کہہ رہے ہوتے کہ ہم میں سے کوئی بھی مکمل کہاں ہے۔ اس لئے کہانی بھی ادھوری رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ ادھوری لگنے والی کہانیاں اپنی جگہ مکمل ہیں۔ ان کے افسانے اس قابل ہیں کہ مغرب کے شہکار افسانوں کے مقابلے میں رکھے جا سکیں۔



بلراج منیرا

کچھ اور نام شامل کر لیں تو یہ نسل بھی بزرگ ہو چکی ہے۔ افسانے میں اقبال مجید سے لے کر حسین الحق، سلام بن رزاق اور ابرار مجیب، صغیر رحمانی تک کے یہاں زیادہ تر پچاس کی عمر سے آگے کے افسانہ نگار ہیں۔ یہ کارواں بھی گزر گیا تو کیا اردو ادب کا سفر ختم جائے گا؟ 2017 کو الوداع کہتے ہوئے ان سوالوں پر غور کرنا ضروری ہے۔ شمس الرحمن فاروقی، گوپی چند نارنگ، شمیم حنفی کے معیار اور قد کا کوئی ناقد ہمارے سامنے نہیں۔ دور تک لمبی خاموشی کا سیرا ہے۔ پاکستان میں کئی نام ہیں جو متاثر کرتے ہیں۔ میزہ احتشام، سین علی، اقبال خورشید، رابعہ الربا، فیس بک پر کہانیاں لکھنے والے بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ہاشم خاں، فارس مغل، راجہ یوسف، شہناز رحمن، فائق احمد، آدم شیر، ہما فلک، حنیف خاں، نورین علی حق، کئی نام ایسے ہیں جنہیں گزشتہ کچھ برسوں میں سنجیدگی سے پڑھا جانے لگا ہے لیکن ابھی تک ان میں سے زیادہ تر کی انفرادی شناخت قائم نہیں ہو پائی ہے۔

وفیات

ایک وقت آئے گا جب ہماری نسل سے بیشتر نام نہیں ہونگے کیونکہ موت ایک حقیقت ہے لیکن لکھنے والوں کا کارواں موجود ہوگا۔ فیس بک ایک بڑی حقیقت ہے۔ فیس بک پر اچھے رسائل کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا ہے۔ سین علی اور نقاط کے مدیر، قاسم یعقوب، اعجاز عبید کا رسالہ 'سمت' نے اس برس اچھی روایت شروع کی ہے۔ اس سلسلے میں اہم نام ابرار مجیب کا بھی ہے۔

اس برس کئی ادیب ہم سے پچھڑ گئے۔ نیر مسعود، بلراج منیرا، بانو قدسیہ، ڈاکٹر اسلم پرویز، حیدر جعفری سید، پروفیسر یوسف تقی، ڈاکٹر تشہ عالمی، گوہر شیخ پوری، خورشید کا کوئی قصہ گواٹھتے جاتے ہیں۔ داستانیں گم ہوتی جا رہی ہیں۔ گیلی لیو کو پھانسی دینے کے باوجود زمین گول رہی۔ ان ناموں کے گزرنے

دن، راجہ گدھ.. امر نیل، کوئی لکیر سیدھی نہیں۔ ہر لکیر دل میں اتر جانے والی گھنٹوں سوچنے پر مجبور کرنے والی۔ مجھے یاد ہے، راجہ گدھ کا مطالعہ کرتے ہوئے ہر دو صفحے کے بعد راجہ گدھ کا مطالعہ کرتے ہوئے ہر نکلنا آسان ہوتا ہے کیا؟ راجہ گدھ علامتی پیرائے میں انسانی تاریخ کا ایسا المیہ بیان کرتی ہے کہ روگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں... ہر قدم ایک نیا فلسفہ ایک نیا سوال ہم پر حاوی ہو جاتا ہے۔ مشرق اور مغرب کی تفریق کو لے کر حاصل گھاٹ لکھا تو یہاں بھی اچھے اچھے فلسفوں کی دستک موجود تھی۔ اشفاق احمد کو ہم گڈریا کے حوالے سے جانتے تھے۔ پہلے یہ دنیا گلوبل نہیں ہوئی تھی۔ پاکستان سے خبریں ہم لوگوں تک تاخیر سے پہنچتی تھیں۔ پھر معلوم ہوا.. اشفاق احمد ڈرامے بھی لکھتے ہیں۔ ٹی وی کی دنیا کا بڑا نام ہیں۔ ہم نے اشفاق احمد کو بانو قدسیہ کے حوالے سے نہیں جانا۔ بانو کو اشفاق احمد کے حوالے کی ضرورت نہیں تھی۔ دونوں کے اسلوب جدا تھے مختلف.. گڈریا کا سرور آج بھی باقی ہے۔ راجہ گدھ کا نشہ آج بھی قائم.. یہ نہ ختم ہونے والا نشہ ہے.. بانو نے صرف راجہ گدھ لکھا ہوتا، تب بھی یہ نام اردو تاریخ کا ایک اہم حصہ ہوتا..

احمد جاوید:

2017 میں اردو افسانے کی ایک بڑی آواز خاموش ہو گئی۔ احمد جاوید چلے گئے۔ فلکشن کی ایک مضبوط کڑی ٹوٹ گئی۔ انیس سو ستر کے عشرے میں جدیدیت کے خیمے سے جو معتبر آوازیں گونجیں، ان میں ایک بہت اہم نام احمد جاوید کا تھا۔ آہستہ آہستہ اپنے دلچسپ اسلوب، فکری روش، ایک عجیب سا ٹیکھا پن، سدھے ہوئے خوبصورت جملوں اور اسکے ساتھ انکے مخصوص بیانیہ نے قاری کا دل جیت لیا، کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیان کے لئے، کہ مصداق ایک چھوٹی سی کہانی کو بھی علامتوں، استعاروں کی مدد سے آفاقی بنانے کا جو ہنر انکے پاس تھا، وہ کم لوگوں کے پاس تھا

اس لئے جدید ہمسواروں کی بھیڑ میں بھی احمد جاوید کے یہاں کہانی پن اور فکر کی تازگی موجود تھی۔ انکے بیانیہ میں کوئی الجھاؤ نہ تھا۔ علامتیں اور استعارے قاری کے ساتھ ساتھ رقص کرتے ہوئے اپنے سارے بھید کھول دیا کرتے تھے۔ میں نے احمد جاوید کو سب سے پہلے انکے افسانوی مجموعہ چڑیا گھر کے حوالے سے جانا۔ احمد جاوید نے چڑیا گھر میں چوہے، بھیڑ بکری، بھیڑیے، کووے، کبوتر، کتے، کیڑے کوڑے، سانپ، چڑیا، جنگل، جانور، آدمی کی پوری فوج اکٹھا کر لی تھی۔ یہ سب انکی کہانیوں کے عنوان تھے۔ یعنی چڑیا گھر حقیقت میں ایک ایسا چڑیا گھر تھا، جہاں جانور اور انسان کا بھید مٹ گیا تھا۔ احمد جاوید اس منظر، پس منظر کے شاہد تھے۔ بقول احمد جاوید، انیس سو ستر کے عشرے میں سیاسی ماحول میں خاصی پلچل پیدا ہوئی جس نے مختلف اذہان کو متاثر کیا۔ تمثیل کے شہر سے پرندوں، جانوروں، حشرات الارض کو فنکارانہ چابک دستی سے، جنگل کی ویرانی کی جگہ داستانی رنگ بھرنے کا جو سلیقہ یا قرینہ احمد جاوید کے یہاں تھا، وہ اتنا منفرد تھا کہ وہ صرف انہیں کا حصہ تھا۔ جانوروں اور پرندوں کی دنیا کو گویا وہ اپنے چاروں طرف آباد کر لیتے تھے۔ پھر ایک انوکھا داستان کو سامنے ہوتا جس کا سارا زور اس بات پر ہوتا کہ روایت سے الگ داستانوں کی ایک نئی دنیا آباد کی جائے۔

پرندے اور ہجرت

دیکھتے ہی دیکھتے یہ سال بھی رخصت ہوا۔ اردو کی ایک بڑی افسانہ نگار نگاہت سلیم کے لفظوں میں اس طرح بھی کہہ سکتا ہوں کہ ایک مسافر گاڑی نے نیم پختہ سڑک پر اتارا اور دیکھتے ہی دیکھتے تہہ در تہہ پھیلے پہاڑی دڑوں میں طاؤس بلقیس کی طرح غائب ہو گئی (جشن مرگ: افسانہ) ہمارا قیام ایک مسافر گاڑی میں ہے اور گزرتے ماہ و سال ہمیں خاموشی سے پہاڑی کے دڑوں میں اچھال دیتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود زندگی ختم ہوتی ہے، نہ فلسفہ۔ وہی پہاڑی دڑے، وہی نیم پختہ سڑک، وہی

مسافر گاڑی..... اس برس کے خاتمے پر یہ مکالمہ ضروری ہے کہ ہم کہاں آگئے؟ آنے والا برس ہمیں کہا لے جائے گا؟ سال کے ختم ہوتے ہوتے اسموگ آسمان کی نیلی چادر میں شگاف کیوں ڈال دیتا ہے؟ میزائل اسلحے اور جنگ جنگ کھیلتے ہوئے ہم ہونسا ہی ہو گئے اور مہاجر بھی۔ اس وقت یہ عالمی ہستی مہاجروں کی ہستی لگ رہی ہے۔ انتظار حسین اپنی ایک کہانی میں سوال کرتے ہیں 'پرندے ڈار سے کچھڑ گئے، طوطا اڑ گیا۔ جواب ملتا ہے، طوطا واپس بھی آ سکتا ہے، نگہت سلیم کہتی ہیں، انسان کبھی کبھی ہجر میں نئے قیام کی طرف مڑ جاتا ہے یا خود اپنے اندر سے ہجرت کر جاتا ہے۔ باب ڈیلن کی موسیقی بھی ان پرندوں کو ہجرت سے نہیں روک سکتی اور جیسا کہ ایک شاعر نے درد مندی سے لکھا، پرندے کو مار دو، نغمہ خاموش ہو جائے گا۔ نئی صدی کے 17 برسوں کا المیہ ہے کہ نغمہ خاموش ہے۔ آسمان پر پھیلے اسموگ سے آگ برس رہی ہے۔ پرندے اپنے ہی گھونسلے میں مہاجر اور درد بدری کی خاک چھانٹتے ہوئے۔ یہ نئی تہذیب کا المیہ ہے۔ جس کی پیشین گوئی برسوں پہلے ہر من پسے نے اپنے مشہور زمانہ ناول 'ڈیسیان' میں کی تھی۔ پرانی دنیا کا زوال نزدیک آ رہا ہے۔ پرندے مر رہے ہیں۔ اس وقت سب سے بڑا حادثہ یہی ہے کہ انسان مہاجر پرندہ بن چکا ہے۔ آسمان سے زہریلی گیس برس رہی ہے۔ پرندے مسلسل ہلاک ہو رہے ہیں۔ جوزف براڈسکی کی نظم یاد آتی ہے، 'جب تم ٹائی کی ناٹ باندھتے ہو، لوگ مر رہے ہیں۔' ماحولیاتی آلودگی اور اسموگ کے باوجود ادب زندگی سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کرتا۔ ادب کی تلاش جاری رہتی ہے۔ اردو کا ادبی افق کل بھی روشن تھا اور آج بھی روشن ہے۔ ادب ان زہریلی گیسوں کے درمیان اپنی راہ ہموار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ہم اجڑیں گے/ پھر بسیں گے۔ ادب ناخوشگوار حالات میں ہی/ زندگی کے بادبان کھولتا ہے۔

زبان کے بہاؤ کا فطری عمل املاء کی اساس میں بدلاؤ کا اعلامیہ

Spirit میں رائج نہیں کر پارے ہیں اور ایک ہی آواز کے کئی کئی الفاظ کے رواج پر بعد ہیں۔

مانا کہ عرب اور ایران میں ان حروف پر مشتمل الفاظ کا تلفظ بالکل واضح طور پر کیا جاتا ہے اور اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ان حروف کے وجود کا جواز صحیح نظر آتا ہے لیکن ہندوستان میں ان حروف کے تلفظ میں کوئی فرق نظر نہیں آتا ہے اور ان سب کی داغ بیل یا تلفظ یکساں ہے۔ ایسے میں ان حروف کے وجود پر سوالیہ نشان لگنا فطری سی بات ہے۔

ہندی کے مشہور ادیب راجندر یادو کے مطابق یہ بھی اپنے آپ میں ایک راہ فرار ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”خوبصورت اور شفاف قسم کی زبان لکھنے والوں کے ساتھ دقت یہ آتی ہے کہ دھیرے دھیرے ان کے اندر ایک قسم کی خود اعتمادی آ جاتی ہے اور وہ خود اعتمادی یہ ہے کہ بات کچھ ہو یا نہ ہو، زبان میں تو ہم بہکا ہی لیں گے۔ وہ اپنی زبان کے جال میں پھنس جاتے ہیں، ان کے پاس نہ کوئی نظر یہ ہوتا ہے، نہ فکر اور نہ ہی حصہ داری۔ حصہ داری ہی نہیں کٹنٹ بھی نہیں ہوتا۔ فکر و خیال کی عدم موجودگی اگر آپ زور بیان سے چھپاتے ہیں تو آپ شفٹ کرتے ہیں۔ آپ زبان و بیان کے حربے چلاتے ہیں، ایسے لوگ وہاں شفٹ کرتے ہیں جہاں زبان و بیان کے Miracle کی ضرورت ہوتی ہے جہاں Smart Dialogue چاہئے۔“

اردو کے بیشتر شعراء، ادباء، نقاد اور محققین یقینی طور پر مندرجہ بالا اقتباس سے متفق نہیں ہیں ورنہ اب تک اردو کے حروف تجزی میں اجتہاد واقع ہو چکا ہوتا۔ یہ ضروری اس لئے ہے کیونکہ اردو والوں میں ایک عام روش بڑی سختی سے قائم ہے کہ جوت اور ط میں چوک گیا، اس، اس اور ط میں

اس سے انکار ممکن نہیں ہے کہ اردو بنیادی طور پر شاعری کی زبان ہے اور شاعری کی زبان دراصل Paradox کی زبان ہوتی ہے۔

مشہور ماہر لسانیات اور اردو زبان کے اسٹریچرل تجزیہ نگار Roman Jakobson نے اس امر کی وضاحت یوں کی ہے:

”جو چیز شاعری اور معمولی بول چال کو الگ کرتی ہے، وہ صوتیات اور آہنگ ہے۔ نظم Signifiers کا ایسا نظام ہے جو Signified کو جذب کر لیتا ہے۔“

تو کیا اردو کا غیر علمی زبان ہونا ہی اس کی سب سے بڑی مشکل ہے۔ شاید اسی لئے اس میں ابھی تک ایک آواز کے کئی کئی الفاظ موجود ہیں۔ ترقی یافتہ زبانیں چاہے انگریزی ہو یا کوئی اور، ان کے یہاں الفاظ کا رد و قبول جاری رہتا ہے اور وقتاً فوقتاً وہ املاء بھی بدلنے رہتے ہیں۔ یورپین انگریزی الگ ہے، وکٹورین انگریزی اس سے بھی الگ ہے۔ امریکہ کی اپنی الگ انگریزی ہے اور ظاہر ہے کہ ایشیا والوں نے اپنی الگ انگریزی گڑھ لی ہے لیکن اتنی طرح کی انگریزی بولی اور لکھی جانے کے باوجود کیا شیبیز، جارج برنارڈشاؤ اور ایڈگرسن پوکی تصنیفات کی شرح نہیں ہو پارہی ہے؟ کیا ان کے جملوں اور ترکیبوں کے معنی اخذ کرنے میں دشواری پیش آرہی ہے؟ اردو میں بھی دکن کی اردو، پنجاب کی اردو، پاکستان کی اردو، شمالی ہندوستان کی اردو سے یکسر مختلف ہے لیکن کیا کہیں خدا نے سخن میر تقی میر کے اشعار کی قدر و قیمت میں کوئی کمی آئی یا غالب کے دُکھینہ معنی کا طلسم، سمجھنے میں کس علاقہ کے اردو داں طبقہ کو دقت ہو رہی ہے؟

پھر اردو میں ہی ایسا کیوں ہے یا مسلسل ایسا کیوں ہو رہا ہے کہ ہم گوشت اور ناخن کے رشتے کو اس کی اصل

اردو جب تک کتابوں میں قید تھی، اخباروں اور رسائل تک محدود تھی، تب تک ذہنوں میں یہ سوال ذرا کم آتا تھا کہ اردو کے حروف تجزی میں ایک آواز کے کئی کئی الفاظ موجود کیوں ہیں مثلاً اس ص ش کی آواز ایک ہے۔ اسی طرح ہ، ہ، ہ، ح، کا ہونا۔ اسی طرح ذ، ز، ض، ظ اور ن، ط۔ ان کی آوازیں ایک ہی سی ہیں۔ پھر اتنے حروف کیوں؟ یہ اردو کی خوبی ہے یا خرابی؟ جب سے دنیا انٹرنیٹ کے گرداب میں آئی ہے تب سے غیر اردو داں طبقہ جو اردو سے اور بطور خاص اردو شاعری سے، بے پناہ محبت کرتا ہے، اردو شاعری کے نرم لہجے کا دیوانہ ہے، تب سے یہ سوال بار بار اس طبقہ کی طرف سے سامنے آتا ہے کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے۔ نیرنگ خیال میں محمد حسین آزاد نے لکھا ہے:

”اس کا نام اردو خود کہتا ہے کہ میں علمی نہیں بازار کی زبان ہوں، اٹھنے بیٹھنے، لین دین کی باتوں کے لئے کام میں آتی ہوں۔“

بازار اب آن لائن ہو چکا ہے تو اردو کو بھی بازار کے مطابق ڈھل جانا چاہئے جیسے سیکڑوں سال پہلے کے بازار میں اس نے جنم لیا۔ مختلف قسم کے پورٹل، ویب سائٹ اور ایپ میں اردو کی Compatibility دقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ لیکن بات لوٹ پھر کر وہیں پر آتی ہے کہ اردو زبان کے پاس جو کچھ اصل سرمایہ ہے وہ شعرائے ہند کی کمائی ہے جنہوں نے فارسی کی بدولت اپنی دکان سجائی ہے۔ نیرنگ خیال میں محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

’بات یہ ہے کہ اس کی سرزمین کی ہوا بگڑی ہوئی ہے جو کچھ ہے وہ اتنا ہی کہ فارسی کے پروں سے اڑی، لفاظی اور مبالغوں کے زور سے آسمان پر چڑھ گئی، وہاں سے جو گری تو استعاروں کی تہہ میں ڈوب کر غائب ہو گئی۔‘

(دیباچہ نیرنگ خیال ص ۱۲)

لفظی کر بیچھا، اسے برسرعام جہلاء کی جماعت میں شامل کرنے سے شاکد ہی کوئی گریز کرتا ہو۔ اردو کا ایک عام طالب اردو کے حروف تہجی کی اس پیچیدگی کو سر کرنے میں اپنی عمر کی سب سے زیادہ طاقت اور توانائی کے دور کے کئی برس کھپا دیتا ہے۔ پگھٹ کی اس کٹھن ڈگر کو پار کرنے کے بعد اردو کے اس طالب کو اصل میں جو حاصل ہوتا ہے، وہ واقعی اتنا قیمتی ہے جتنا اسے بنا دیا گیا ہے؟ اس بات پر غور کیا جانا اب اشد ضروری ہے کہ آخر حروف تہجی کی یہ خوبی یا خامی ہمارا سب سے بڑا امتحان کیوں ہے۔

اردو کے اکثر و بیشتر ادباء اور شعراء اس بات سے اچھی طرح سے واقف ہیں کہ دیوناگری رسم خط میں ایک نئی اردو جنم لے چکی ہے۔ ہندی کے سرکردہ ناشرین میں راج کمل، وانی، رادھا کرشن کی فہرست کتابیات اٹھا کر دیکھ لیجئے، ساٹھ فیصد سے زیادہ اردو ادب ان کے رسم خط میں دھوم دھام سے فروخت ہو رہا ہے اور انہیں مالامال کر رہا ہے۔ ہندی رسم خط میں اردو کا بازار روز بہ روز گرم ہو رہا ہے اور ہمیں اپنے خسارے کی فکر بالکل نہیں ہو رہی ہے۔ خطرہ یہ ہے کہ آن لائن ادب کے کاروبار میں بھی ہندی رسم خط میں لکھی جانے والی اردو، اردو رسم خط میں لکھی جانے والی اردو پر سبقت حاصل کر چکی ہے۔ اس بازاری مقابلے میں ہماری اردو رسم خط والی زبان کتنے دن ٹھہر پائے گی؟ ہمیں اس امر سے بھی اچھی طرح واقفیت ہونی چاہئے کہ ہندوستان کی ہی کئی زبانیں ہیں جو کئی رسم خط میں لکھی جا رہی ہیں۔

مدرسوں، کتبوں، اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں میں جو اردو پڑھائی جا رہی ہے وہ اردو بازار میں کہاں ہے اور اس پر طرہ یہ کہ اردو لشکر کی زبان ہے، بازار کی زبان ہے۔

ہماری اس پیاری اور محبوب زبان کے مقابلے میں فی الحال ہندی ہی تو ہے، اور ہم اسی ہندی میں اپنے تمام الفاظ، تراکیب، اصطلاحیں خاموشی سے استعمال ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں اور خوش اس بات پر ہیں کہ یہ ہندی والے اردو ہی تو لکھ رہے ہیں، اردو ہی تو بول رہے ہیں۔

ساتھ میں یہ بھی کہتے ہیں کہ ہندی میں تو سب کچھ چلتا ہے۔ ان کے وہاں زبان کی پاکیزگی کو باقی رکھنے کا عمل کمیاب ہے۔ ہمیں تو یہ بھی ایک قسم کا فرار ہی لگتا ہے۔ آخر ہندی میں हिन्दी کو ان لوگوں نے हिन्दी لکھنا شروع کر دیا تو اس لفظ پر کیا فرق پڑا۔ آدھی صدی بھی نہیں گزری ہے جب ان کے یہاں आ लکھا جاتا تھا اور اب وہ اس طرح आ लکھ رہے ہیں۔ اس طرح کی سیکڑوں مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

نیا دور فیس بک اور واٹس اپ پر بھی
نیا دور کے اس سال کے تمام شمارے فیس بک
اور واٹس اپ پر قارئین کے مطالعہ لئے مسلسل پوسٹ
کئے جا رہے ہیں اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جارہے گا۔

اس طرح کی آسان پسندی سے ہندی کے علماء پر کیا فرق پڑ گیا اور کس لفظ کے معنی و معیار بدل گئے حالانکہ یہ بھی صحیح ہے کہ ہندی تو کیا کسی بھی زبان میں کسی بھی زبان کے الفاظ کی آمد و رفت کو روکا نہیں جا سکتا۔

میرے زمانے میں 'کون' دونوں حروف کی صرف ایک ہی شکل 'ن' تھی۔ اس وقت 'ئی' اور 'ئے' کو بھی دوسری صرف 'ئی' لکھا جاتا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل تک اردو میں غلط العام اور غلط العوام کی بنیاد پر لفظوں کے رد و قبول کا عمل بھی دوسری زبانوں کی طرح جاری رہا لیکن بیسویں صدی آتے آتے اس میں زبردست ٹھہراؤ آ گیا۔

معروف محقق و نقاد شمس الرحمن فاروقی نے اپنے مضمون 'اردو میں غیر زبانوں کے الفاظ' میں درجنوں

نیا دور ریختہ پر

اس سال نیا دور کے تمام شمارے rekhta.org پر
اپلوڈ کروئے گئے ہیں۔ عالمی سطح پر اردو کے مختلف حلقوں
تک نیا دور کی رسائی میں اب کوئی دشواری نہیں رہے گی۔

مثالیں دیتے ہوئے بتایا ہے کہ دوسری زبانوں کے 'دخیل' لفظ اردو میں کس طرح کبھی عربی اور کبھی فارسی قواعد کا استعمال کرتے ہوئے اپنی سہولت کے اعتبار سے گڑھ لئے گئے ہیں مثلاً فارسی لفظ 'رنگ' پر عربی کا تائے صفت لگا کر 'رنگت' بنا لیا گیا۔ عربی لفظ 'طرفہ' پر

فارسی کی علامت فاعلی لگا کر 'طرفلی' بنا لیا گیا۔ عربی لفظ 'دلفش' پر خلاف قاعدہ تائے وحدت لگا کر 'دلفشہ' بنا لیا اور اس کے معنی بھی بدل گئے۔ اس طرح کی متعدد مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

یہ ایک فطری عمل ہے اور یہ بھی ایک فطری عمل ہے کہ زبان آسانیاں تلاش کرتی ہے۔ زبان ایک فطری بہاؤ کا نام ہے۔ اس پر کسی کا کوئی زور نہیں چلتا لیکن اردو میں یہ زور چلتا ہوا نظر آتا ہے کہ سیکڑوں برس پرانا املاء اور حروف تہجی کو من و عن باقی رکھا گیا ہے اور اپنی اسی جہد مسلسل کو اردو داں طبقہ اپنی بہت بڑی کامیابی اور Achievement گردانتا ہے۔

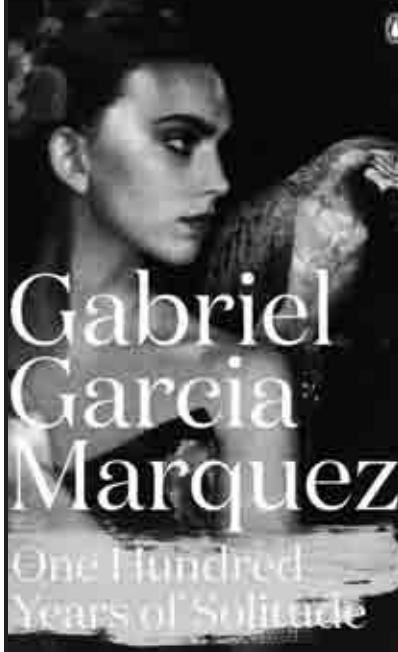
'طوطے' کو تو تے، لکھا جائے تو کیا قیامت گزر جائے گی۔ آخر کس کسی بھی لفظ میں معنی کے دخول کا ذریعہ تو عوام ہی ہیں۔ ہندی کے مشہور مزاح نگار شرد جوشی ایک مرتبہ مدھیہ پردیش کے قبائلی علاقوں میں گئے ہوئے تھے کہ شام ہو گئی۔ انہوں نے نارچ جلائی تو وہاں پر تمام بچوں نے انہیں گھیر لیا۔ شرد جوشی نے پوچھا، یہ کیا ہے؟ بچوں نے جواب دیا 'چمکیلی'، شرد جوشی نے یہ واقعہ ہمیں زبان کے تروتق کے سیاق و سباق میں سنایا تھا۔ ۱۹۸۹ء کی بات ہے، ٹائمس گروپ کی ملازمت کے دوران پٹنہ میں ہماری پوسٹنگ تھی۔ ایک روز عالم گنج میں ہم سبزی لینے گئے، سبزی کی دکان پر ایک مضمون سی پی بی پی تھی۔ ہم نے اس سے آلو مانگے تو اس نے جواب میں ہم سے پوچھا، 'چمکیلائے' ہم ہونقوں کی طرح اس سے آلو تو لئے کو کبتے رہے اور وہ بار بار 'چمکیلائے'، 'چمکیلائے' دہراتی رہی۔ وہ تو بھلا ہو کہ صدر امام قادری نظر آگئے اور انہوں نے مسئلہ یوں حل کیا کہ وہ پوچھ رہی ہے کہ تم سبزی لینے کے لئے پالی تھیں بیگ لائے ہو؟ اس بیگی کے ذہن میں پالی تھیں بیگ کا مطلب 'چمکی' تھا یعنی کسی بھی لفظ کو متعارف کرانا اور اس میں معنی بھر دینا ایک عام اور فطری عمل ہے۔ اردو میں کس لفظ میں عربی قاعدے کا استعمال کیا جائے گا اور کس میں فارسی قاعدہ نافذ کیا جائے گا، جب اسے سختی سے نافذ

ضرورت ہے۔ اردو کے حروف تہجی کی پیچیدگیوں پر ہم اس شمارے میں بطور خاص تین مضامین اسی لئے شائع کر رہے ہیں کہ یہ بحث آگے بڑھ سکے۔ ہم پورے ادب و احترام سے اپنے استاد پروفیسر گوپی چند نارنگ سے استدعا کر رہے ہیں کہ اس معاملے میں وہ رہبری فرمائیں۔ دور حاضر کے معروف ادیب، نقاد و محقق جناب ٹمس الرحمن فاروقی اور پروفیسر شمیم حنفی سے بھی مودبانہ گزارش ہے کہ وہ اپنی بیش قیمت آراء سے نوازیں۔ تمام دوسرے ماہرین لسانیات سے بھی ہماری یہی درخواست ہے۔

۱۲ ربیع الاول کے مناسبت سے اس شمارے میں ہم نظمیہ کلام میں مشاہیر کی نعت پیش کر رہے ہیں اور ربیع الاول کے مراسم پر لکھنؤ کی سرکردہ دینی شخصیت مفتی ابو العرفان میاں فرنگی محلی کا مضمون بھی شامل ہے۔ ہمیں یہ بتاتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے اب نیا دور کے ہر شمارے میں 'گل افشائیاں' کے تحت ایک مزاحیہ ضرور شامل کیا جائے گا۔ 'نیا دور' کے نومبر کے شمارے پر انگریزی کے موقر اخبار The Hindu میں پروفیسر شافع قدوائی نے جو تبصرہ فرمایا، اس کے لئے ادارہ نیا دور ان کا ممنون ہے۔ ہم اپنے کرم فرما محترم ٹمس الرحمان فاروقی صاحب کے بھی شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہماری رہنمائی فرمائی۔ ایران کلچرل ہاؤس کے ثقافتی کانسلر نے اکتوبر کے شمارے کی تعریف میں ہمیں خط بھیجا۔ ان کی اس حوصلہ افزائی کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ پروفیسر شافع قدوائی کے ہم اس لئے بھی شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہماری فرمائش پر اردو کے حروف تہجی پر ایک مضمون ارسال کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر غضنفر اور نہال الدین عثمانی کا بھی شکریہ نیز ہم ریختہ کے بھی ممنون ہیں کہ انہوں نے مئی ۲۰۱۷ء سے تاحال 'نیا دور' کے سارے شمارے اپنی ویب سائٹ پر اپلوڈ کئے ہیں۔

محمد رفیق

تہائی کے سوسال



بیسویں صدی کے بحیر العقول تخلیق کار گارسیا گبریل مارکیز کے شاہکار ناول 'تہائی کے سوسال' کو شائع ہونے پچاس برس پورے ہو گئے۔ اسی ناول پر انہیں ادب کے نوبل انعام سے نوازا گیا۔ اسپینش زبان میں مارکیز کو خدا کے بعد سب تخلیق کار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بائبل کے بعد سب سے زیادہ کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔ ان کی کتابوں کے دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمے شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ عالمی ادب کی اس عظیم شخصیت کی تحریروں کو دنیا بھر میں ابھی بھی بڑے ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ مارکیز کی چوتھی برسی پر انہیں خراج عقیدت کے طور پر اپریل ۲۰۱۸ء کے 'نیا دور' میں ان کے افسانوی فن پاروں پر مضامین کے علاوہ ان کے شہرہ آفاق ناول 'تہائی کے سوسال' کے اقتباسات کا ترجمہ بھی شائع کیا جائے گا۔

نہیں کیا جا سکا تو پھر ایک آواز کے چار چار الفاظ کو قائم رکھنا کس حد تک درست ہے۔

ہمیں اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ حروف تہجی کی ان چرخار راہوں کی انگشت نمائی کا انجام کیا ہوگا۔ اکثر و بیشتر لوگ اس پر چراغ پا ہو جائیں گے۔ کئی لوگ یہ بھی کہیں گے کہ الماء درست ہونا زبان سیکھنے کی پہلی شرط ہے، یہ صحیح بھی ہے لیکن کون سا الماء، کتنا سخت الماء اور خواہ مخواہ میں اتنا سخت الماء اور حروف تہجی میں غرور ضروری الفاظ کیوں؟ ہمیں یہ بھی پتہ ہے کہ ہمیں اس انگشت نمائی کی کیا قیمت ادا کرنی پڑے گی لیکن کوئی بات نہیں۔ حیات اللہ انصاری اور رشید حسن خاں جیسی نامور شخصیتوں نے اردو الماء میں جو کچھ Reform کئے تھے، انہیں اردو والے پہلے ہی دھتتا بنا چکے ہیں۔ اس ضمن میں عصمت چغتائی نے 'ٹیڑھی لکیر' میں کیا عمدہ بات کہی ہے کہ اردو والے ہرٹی چہرہ کو رد کرنا اپنا پہلا فریضہ سمجھتے ہیں۔ ہمیں اپنی اس روش پر بھی بہر حال فکر کرنا چاہئے۔ انٹرنیٹ کے ذریعہ اردو زبان دنیا کے بازار میں قدم رکھ چکی ہے، اسے طرح طرح کے امتحانوں سے گزرنا باقی ہے، اس کی برانڈنگ اور مارکیٹنگ کے نئے راستے سامنے آ رہے ہیں۔ پوری دنیا میں ایک نئے ای۔قاری کا وجود عمل میں آچکا ہے۔ ای۔قاری کے پاس وقت کم ہے۔ راستوں میں، دفتر میں، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے موبائل فون کی اسکرین پر اسے لکھنا پڑھنا ہے۔ کیا ہمیں اس قاری کی فکر نہیں کرنی چاہئے جو تعداد میں کتابوں کے قاری سے سیکڑوں گنا زیادہ ہے اور اردو کا مستقبل غالباً اسی قاری کے ہاتھوں میں محفوظ ہے۔ کیونکہ اس صدی کا محور و مرکز پوری طرح سے ٹیکنیک پر منحصر ہے۔ مستقبل قریب میں قومی امکان ہے کہ مشینوں کی رفتار انسانی چال پر سبقت حاصل کر لے۔ جدید انسان اس مشینی انقلاب سے نبرد آزما ہونے کے لئے کس حد تک تیار ہے، اس کا فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے۔ ہمیں اردو کے مستقبل کو اس پس منظر میں دیکھنے کی اشد



شافع قدوائی

صدر شعبہ برنلزم ایڈماس کمیونیکیشن

اے ایم پوبلی گزٹھ موبائل: 9412317370

زبان کا تریسیلی کردار اور حرف تہجی

زبان کی مقبولیت کا انحصار بیشتر صورتوں میں اس کے تریسیلی کردار پر ہوتا ہے۔ ذخیرہ الفاظ، قواعد، صرف ونحو اور رسم الخط کی اساسی اہمیت کے باوجود زبان کی ہمہ گیر انجیل اجتماعی سماجی اور ثقافتی حافظہ (Socio-cultural memory) کی رہن منت ہوتی ہے۔ زبان تغیر و تبدل سے عبارت ہے اور معنی، املا، رسم الخط، صرفی اور نحوی قاعدے اور تذکیر و تانیث کے اصولوں اس سے مبرئی نہیں ہیں۔ حتی کہ زبان کے حروف تہجی میں بھی رد و بدل کے امکانات ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ فلسفہ لسان سے عدم واقفیت اکثر زبان کے اصولوں پر بے جا اصرار کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور اکثر رسم الخط اور حروف تہجی میں تبدیلی کی ہر کوشش کو زبان کی تیخ کنی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ رسم الخط کی تبدیلی کو اکثر ناخن کو گوشت سے الگ کرنے کے مترادف قرار دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ زبان کا تہذیبی تشخص ایک مخصوص رسم الخط سے قائم ہوتا ہے اور اگر رسم الخط کو بدل دیا جائے تو زبان خود بخود ختم ہو جائے گی۔ اس نقطہ نظر میں صداقت کا عنصر بہر حال موجود ہے مگر زبان کی نشوونما کا معاملہ بہت پیچیدہ ہے اور یہ مسئلہ اتنا سادہ اور سہل نہیں، جتنا سمجھا جاتا ہے۔

دنیا میں بہت سی ایسی زبانیں ہیں جو ایک سے زائد رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں۔ ہندوستانی زبانوں میں پنجابی، سندھی، کوئی اور کھاسی کی مثالیں سامنے کی ہیں۔ کوئی، کنڑ، مراٹھی اور روسن رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں، پنجابی گورکھی اور شاپوری اور سندھی بھی ایک سے زائد

رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ روس میں متعدد زبانیں ہیں جو دو سے زائد رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں۔ ان کا تہذیبی تشخص کس رسم الخط میں محفوظ ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر سنجیدگی سے غور کرنا ضروری ہے مگر زبان سے جذباتی وابستگی کے باوصف رسم الخط کے

زبان میں کوئی چیز صحیح یا غلط نہیں ہوتی، ایک چیز رائج ہوتی ہے دوسری نارائج۔ ذرائع ابلاغ زبان کے اس رائج تصور سے مسلسل کسب فیض کرتے ہیں اور حافظہ کی پہلی پرت پر موجود الفاظ یا ان کی غلط العام صورتوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ صوت اور تحریر میں باہمی تطابق کی تلاش لسانیات کے ماہرین کا بنیادی مسئلہ ہے۔ حروف تہجی کس طرح مختلف اصوات کی نمائندگی کرتے ہیں اور کیا ان میں رد و بدل کا کوئی امکان نہیں ہے، ماہرین لسانیات اس مسئلے سے مسلسل نبرد آزما رہتے ہیں۔ اکثر زبانوں میں کسی ایک آواز کی نمائندگی کے لئے کوئی ایک متعین حرف تہجی نہیں ہوتا۔

مسئلہ پر محض جذباتی رد عمل کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ خاطر نشان رہے کہ یہاں رسم الخط میں تبدیلی کی وکالت نہیں کی جارہی ہے بلکہ یہاں مسئلہ کے دوسرے پہلو کو موضوع بحث بنانے کی سعی کی جارہی ہے۔

اکیسویں صدی کا بنیادی شناس نامہ ذرائع ابلاغ ہیں اور ہماری روزمرہ کی ضروریات سے لے کر

سیاسی، سماجی، لسانی، فکری، تہذیبی اور ذہنی سرگرمیوں کی تکمیل میں ان کا رول فیصلہ کن ہوتا ہے۔ ذرائع تریسیلی مختلف ذہنی استعداد، تہذیبی پس نظر، مذہبی اور اخلاقی اقدار اور مختلف زبانوں کے بولنے والوں کے مابین ایک قابل قبول بیانیہ عرصہ (Narrative Space) خلق کرتے ہیں جس کی اساس زبان کے تریسیلی کردار (Function) پر استوار ہوتی ہے۔

زبان کے تریسیلی کردار سے مراد ایک ایسے محاورہ بیان کا مسلسل استعمال ہے جس سے پیغام کی تریسیلی فی الفور ہو جائے اور تریسیلی کے عمل میں دو افراد کے مابین گفتگو کی سی برجستگی (Immediacy) پیدا ہو جائے۔ زبان سے عدم واقفیت یا کم واقفیت تریسیلی کی راہ میں مزاحم نہ ہو۔ اخبار، علی الخصوص ریڈیو اور ٹی وی چینل، بول چال کی زبان تو اکثر کے ساتھ استعمال کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ تحریری لفظ (Written Word) کے بجائے بولے جانے والے لفظ (Spoken Word) کو مرکز توجہ بنائیں۔ یہاں لکھنے کا عمل گفتگو سے مماثل ہو جاتا ہے۔ کسی لفظ کے معنی

یا تلفظ کا انحصار اس امر پر ہوتا ہے کہ عوام اسے کس صورت میں قبول کر رہے ہیں اور یہ لفظ کس طرح مقصود معنی کی تریسیلی کر رہا ہے۔ مخالفت کی جگہ مخالفت؛ خوشنما (موسم خوشنما رہے گا) بجائے خوشگوار، قواعد (پولس نے دہش دینے کی قواعد شروع کر دی ہے) بمعنی سرگرمی یا مشق، خلاصہ بمعنی تلخیص، مدعا بمعنی مسئلہ، عام طور پر

ہے۔ مزید برآں، ان حروف تہجی سے صحیح معنی کا تعین بھی ہوتا ہے مثلاً ”زیاں“ اور ”ضیاء“، دونوں الفاظ ہم صوت ہیں۔ زیاں کے معنی خسارے کے ہیں اور ضیاء کے معنی روشنی کے ہیں۔ لہذا کسی ایک حرف کو ”Z“ کے لئے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ پہلی دلیل کے رد میں کہا جاتا ہے کہ اگر یہ پتہ چل گیا کہ یہ لفظ کس زبان کا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے اور معنی کس طرح متاثر ہوتے ہیں، تاہم دوسری دلیل جو معنی سے متعلق ہے، اہم ہے اور اسی سے مختلف حروف کا جواز قائم ہوتا ہے۔ انگریزی اور دیگر زبانوں میں بھی کسی ایک آواز کی ادائیگی کے لئے کوئی ایک متعین حرف نہیں ہے۔ لہذا اس بنیاد پر صرف اردو کو مطعون کرنا یا اس کے حروف تہجی میں تبدیلی پر اصرار مناسب معلوم نہیں ہوتا، ہر چند کہ حروف تہجی کو منطقی بنیاد پر استوار کرنا بھی ضروری ہے۔

□□□

مستثنیٰ نہیں ہے۔ انگریزی حرف ’Z‘ کے لئے اردو میں ز، ذ، ض، ظ اور کسی حد تک ’ژ‘ ہے، اسی طرح ’S‘ کے لئے ش، س اور ص ہیں۔ بولنے میں تو دقت نہیں ہوتی مگر لکھنے میں، خصوصاً زبان کے مبتدیوں اور اس سے گہری واقفیت نہ رکھنے والوں کو دشواری پیش آتی ہے اور ان آوازوں کو جب تحریری زبان میں نوآموز منتقل کرتے ہیں تو ان کا املا غلط ہو جاتا ہے۔ ذرائع ابلاغ کے بعض ماہرین اور بعض معروف شاعروں مثلاً جاوید اختر نے اردو حروف تہجی میں تخفیف کرنے اور ایک آواز کے لئے ایک حرف کے استعمال کی پرزور کالت کی ہے۔ ’Z‘ کے لئے چار حروف تہجی کے استعمال کے حق میں ماہرین یہ دلیل دیتے ہیں کہ ز، ذ، ض، ظ کے استعمال سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ لفظ کس زبان کا ہے، عربی کا ہے یا فارسی کا یا پھر ہندی کا۔ مسالہ (گرم مسالہ) ’س‘ سے اس لئے لکھا جاتا ہے کہ یہ ہندی لفظ ہے۔ مصالحہ عربی ہے جو صحت کی جمع

مستعمل ہیں۔ زبان کے ماہرین اسے کبھی قبول نہیں کریں گے تاہم ان الفاظ کے معنی اگر سولوگوں سے پوچھے جائیں تو ان میں ۸۰ فی صد سے زائد لوگ وہی معنی بتائیں گے جن کا استعمال ٹی وی چینل کرتے ہیں۔ زبان میں کوئی چیز صحیح یا غلط نہیں ہوتی، ایک چیز رائج ہوتی ہے دوسری نارائج۔ ذرائع ابلاغ زبان کے اس رائج تصور سے مسلسل کسب فیض کرتے ہیں اور حافظہ کی پہلی پرت پر موجود الفاظ یا ان کی غلط العام صورتوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ صوت اور تحریر میں باہمی تطابق کی تلاش لسانیات کے ماہرین کا بنیادی مسئلہ ہے۔ حروف تہجی کس طرح مختلف اصوات کی نمائندگی کرتے ہیں اور کیا ان میں ردوبدل کا کوئی امکان نہیں ہے، ماہرین لسانیات اس مسئلے سے مسلسل تہرہ آور رہتے ہیں۔ اکثر زبانوں میں کسی ایک آواز کی نمائندگی کے لئے کوئی ایک متعین حرف تہجی نہیں ہوتا۔ اردو بھی اس سے

’نیادور‘ جنوری ۲۰۱۸ء کے شمارے کی ایک جھلک

مشہور ادیب، صحافی اور افسانہ نگار عابد سہیل کی دوسری برسی پر انہیں بطور خراج ان کے فن اور شخصیت پر شارب ردولوی اور شکیل صدیقی کے مضامین کے ساتھ ’جو یاد رہا‘ کے اقتباسات

شموئل احمد، رابعہ الربا، سلیم اختر اور رخشندہ روجی کے افسانے

رئیس انصاری، رئیسہ خمار اور ظفر صہبائی کی غزلیں نیز عرفان شہود، ڈاکٹر حنیف ترین

اور مسرور صغریٰ کی نظمیں

مراٹھی ناول ’ایندھن‘ کی آٹھویں قسط، غیر ملکی ادب، گزشتہ لکھنؤ اور دیگر تخلیقات



غضنفر

ڈائریکٹر، ناؤم چومسی کا پبلس، APDUMT

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، موبائل: 990237388

اردو رسم خط کی چند بنیادی باتیں

لیے گئے ہیں۔ عربی میں تو ان سب کی الگ الگ آوازیں ہیں مگر اردو میں ان سب کی آواز ایک ہی ہے۔ نئے اردو سیکھنے والوں کو ان سے پریشانی بھی ہوتی ہے کہ وہ یہ نہیں سمجھ پاتے کہ کسی ایک آواز کے لیے ان میں سے کون سا حرف استعمال کیا جائے۔ اس بنیاد کے پیش نظر اردو رسم خط پر ایک یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ یہ غیر سائنسی زبان ہے اور بعض ماہر لسانیات یہ تک کہتے ہیں کہ ٹ، ڈ، ظ، ض، ط وغیرہ حروف مردہ لاشیں ہیں جنہیں اردو رسم خط اپنے کندھے پر اٹھائے پھرتا ہے۔ بیشک ان حروف سے لکھنے پڑھنے میں دشواریاں پیش آتی ہیں مگر ہم انہیں اردو رسم خط سے خارج نہیں کر سکتے کیونکہ اگر ایسا کیا گیا تو اردو کے سارے سرمائے کو از سر نو لکھنا اور چھاپنا پڑے گا جو ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اس طرح کی خامیاں صرف اردو رسم خط میں ہی نہیں بلکہ دوسری زبانوں میں بھی موجود ہیں۔ ہندی زبان جس کے رسم خط کو سب سے زیادہ سائنٹفک زبان کہا جاتا ہے اس میں بھی (j) آواز کے لیے کئی کئی حروف ہیں۔ مثلاً dʒeːdʲik, fdzːk, dʒuk، وغیرہ میں (j) کے لیے الگ الگ حرف استعمال کیا جاتا ہے اور انگریزی جو دنیا کی سب سے مشہور زبان سمجھی جاتی ہے اس میں تو اس طرح کی خامیاں بھری پڑی ہیں۔ دراصل زبان اس طرح کی سائنس نہیں ہو سکتی جس طرح کے دوسرے سائنسی مضامین ہوتے ہیں۔

مصمتی حروف (Consonant Letters) زیادہ ہوتے ہیں۔ الفاظ کی تشکیل میں ان دونوں طرح کے حروف کا ہونا ضروری ہے۔ یہ ممکن تو ہے کہ مصوتے (Vowels) بغیر مصمتے (Consonants) کے الفاظ بنا دیں لیکن یہ ممکن نہیں کہ مصوتے کے بغیر صرف

اردو حروف تہجی میں بعض آوازوں کے

لیے ایک سے زیادہ حروف ہیں۔ مثلاً ز آواز کے لیے زذض اور ظ چار حروف ہیں۔ اسی طرح ت آواز کے لیے ت اور ط دو حروف اور س آواز کے لیے ث، ہ اور ص تین حروف ہیں۔ یہ سارے حروف عربی سے لیے گئے ہیں۔ عربی میں تو ان سب کی الگ آوازیں ہیں مگر اردو میں ان سب کی آواز ایک ہی ہے۔ نئے اردو سیکھنے والوں کو ان سے پریشانی بھی ہوتی ہے کہ وہ یہ نہیں سمجھ پاتے کہ کسی ایک آواز کے لیے ان میں سے کون سا حرف استعمال کیا جائے۔ اس بنیاد کے پیش نظر اردو رسم خط پر ایک یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ یہ غیر سائنسی زبان ہے۔

مصمتوں سے کوئی لفظ بن جائے۔

اردو حروف تہجی میں بعض آوازوں کے لیے ایک سے زیادہ حروف ہیں۔ مثلاً ز آواز کے لیے زذض اور ظ چار حروف ہیں۔ اسی طرح ت آواز کے لیے ت اور ط دو حروف اور س آواز کے لیے ث، ہ اور ص تین حروف ہیں۔ یہ سارے حروف عربی سے

ہر زبان کا اپنا ایک رسم الخط ہوتا ہے جو اس زبان میں سوچے اور بولے گئے خیالات و محسوسات کے اظہار کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اردو ایک زبان ہے اس کا بھی ایک رسم خط ہے۔ اردو کا رسم خط وہی ہے جو عربی اور فارسی زبانوں کا ہے اور جو عربی رسم الخط سے مشہور ہے۔ لیکن اردو کا اپنا جو رسم خط ہے اس میں تھوڑی سی تبدیلی ہو چکی ہے۔ کیونکہ اس کے حروف ابجد میں کچھ ایسے حروف بھی شامل ہیں جو عربی و فارسی کے رسم خط میں موجود نہیں۔ مثلاً ٹ، ڈ، ظ، ض، ط۔ اردو نے یہ حروف ہندی یا ہندوستانی آوازوں، جو اردو زبان میں شامل ہو چکی ہیں، کے اظہار کے لیے بنائے ہیں۔ اب یہ اس کے اپنے حروف ہیں جو ہندوستانی آوازوں کی ادائیگی کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ ان حروف کی شمولیت کی وجہ سے اردو رسم خط (Perso Arabic) رسم الخط ہوتے ہوئے بھی اس سے مختلف ہو گیا ہے۔ اس لیے اسے اب اردو رسم خط کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

ہر زبان کے رسم خط میں دو طرح کے حروف ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے حروف کو مصوتہ (Vowel) اور دوسری قسم کے حروف کو مصمتہ (Consonant) کہتے ہیں۔ یہ دونوں طرح کے حروف دو طرح کی آوازوں کو پیش کرتے ہیں۔ مصوتے مصوتی آوازوں کو اور مصمتے، مصمتی آوازوں کو۔ مصوتی آوازوں کی تعداد کم مصمتی آوازوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور اسی مناسبت سے کسی بھی زبان میں مصوتی حروف (Vowel Letters) کم اور

اردو مصوتے

اردو میں دس مصوتے ایسے ہیں جو لکھے جاتے ہیں یعنی جن کے اظہار کی علامات موجود ہیں۔ ویسے اردو میں دس سے زیادہ مصوتے ہیں۔ مثلاً ”احسان“ لفظ میں جو ابتدائی مصوتہ ہے وہ ”ا“ اور ”آ“ سے مختلف ہے۔ یعنی اس لفظ کو ”ihsaas“ بولتے ہیں اور نہ ہی ”Ahsas“ بلکہ ان دونوں کے درمیان کی آواز بولی جاتی ہے جس کے اظہار کے لیے اردو میں کوئی علامت موجود نہیں ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی مصوتے ہیں جن کے لیے اردو میں علامت نہیں ہے۔ ایسی آوازوں کے تحریری اظہار کے لیے قریبی علامت کا سہارا لیا جاتا ہے یا ان کی جگہوں کو یوں ہی چھوڑ دیا جاتا ہے جیسے ”سنٹر“۔ بعض لوگ اس لفظ کو ”سنینتر“ لکھتے ہیں کیونکہ ’ے‘ قریبی مصوتہ ہے اور بعض لوگ اس لفظ میں ’ے‘ نہیں لکھتے کیونکہ اس کے لکھنے سے اس لفظ کا تلفظ ”سنینٹر“ ہو جاتا ہے جو صحیح نہیں کیونکہ ”س“ اور ”ن“ کے درمیان کی آواز ’ئے‘ کی نہیں بلکہ ’اے‘ اور ’اُ‘ کے بیچ کی آواز ہے۔ چونکہ اس بیچ کی آواز کے لیے اردو میں کوئی علامت موجود نہیں ہے اس لیے ایسی صورت میں کوئی قریبی علامت لکھنے کے بجائے یوں ہی چھوڑ دینا زیادہ مناسب رہے گا۔

لکھے جانے والے

اردو مصوتوں (Vowels) کا چارٹ

ابتدائی حالت	درمیانی حالت	3
اُ	ا	x
اِ	ا	x
آ	آ	x
آ	آ	a
او	و	w
اُو	وُ	wu
اَو	وِ	wi
اِہ	پِہ	ph

ایہ
ایہ
نوٹ

آخری حالت میں خفیف مصوتے (Short Vowels) اور ’ُ‘ نہیں لکھے جاتے۔

ہاں کچھ لفظوں میں یہ بولے ضرور جاتے ہیں۔ مثلاً پ، نہ۔ ان لفظوں میں آخری حرف ’تو‘ مخفی ہے لیکن آواز خفیف مصوتہ زیر کی دے رہا ہے۔ نیچے کچھ ایسے الفاظ دیے جا رہے ہیں جن میں اردو کے ان دسوں مصوتوں کا استعمال ہوا ہے:

ابتدائی حالت درمیانی حالت آخری حالت

اُب	جِب	x
اِس	دِل	x
اُس	بِت	x
اَب	بِت	bt
اولا	بول	do
اؤن	دؤر	du
اؤر	دؤڑ	du
اِبجاد	چپٹ	chati
ایڑی	پیٹ	dei
ایوان	پنر	pani

اردو میں مصوتی آوازیں دو طرح کی علامات

کے سہارے لکھی جاتی ہیں۔ خفیف مصوتے (Short Vowels) یا ان کی آوازیں ’اُ اِ اِ‘ اعراب (Diacritic Marks) کے ذریعہ ظاہر کی جاتی ہیں اور طویل مصوتوں (Long Vowels) کی آوازیں مندرجہ ذیل حروف ’ا، و، ی اور ے‘ کی مدد سے لکھی جاتی ہیں۔ اعراب زیر زیر اور پیش ’علاحدہ استعمال نہیں ہوتے۔ یہ دو مصوتوں کو جوڑنے کا کام کرتے ہیں مثلاً جب ’بد، جس، تیس، رُت، بت وغیرہ۔‘

ا۔ جو حرف مصوتی آوازوں کو لکھتے ہیں یا ان کو

لکھنے میں مدد کرتے ہیں ان میں سے ’ا‘ ایک ہے۔ یہ اردو کا پہلا حرف ہے۔ یہ ایک املائی علامت بھی ہے جو ابتدا میں مصوتے کی مدد کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے ’اب، اس، اُس۔ یہاں ’ا‘ کی اپنی کوئی آواز نہیں ہے۔ یہ محض ’‘ اور ’و‘ کو لکھنے میں مدد کر رہا ہے۔ لیکن یہی ’ا‘ جب لفظ کی درمیانی اور آخری حالت میں آتا ہے تو اس کی اپنی آواز ہوتی ہے اور وہاں یہ طویل مصوتہ ’vk‘ کو پیش کرتا ہے۔ مثلاً بات، بتا، بال، بالا وغیرہ۔ ان لفظوں میں ’vk‘ درمیان اور آخر میں آیا ہے اور طویل مصوتہ (Long vowel) کی آواز دے رہا ہے۔

ابتدائی حالت میں ’ا‘ کا استعمال دو شکلوں میں ہوتا ہے۔ خفیف مصوتے کی مدد کے روپ میں جیسے اخبار، انسان، اُفتاد وغیرہ اور طویل مصوتے او، اُو، اِ، اِی، اِے کی ترجمانی کی شکل میں۔ جیسے اولا، اؤن، اؤلا، اہمان، اہو ان وغیرہ۔

درمیانی حالت میں ’ا‘ کی اپنی آواز ہوتی ہے اور یہ طویل مصوتہ ’vk‘ کو پیش کرتا ہے۔ مثلاً جام، بات، تاج، رواج وغیرہ۔ درمیانی حالت کی طرح آخری حالت میں بھی یہ طویل مصوتہ ’vk‘ کی آواز دیتا ہے۔ مثال کے طور پر خطا، خطا، دو، صدا وغیرہ۔

طویل مصوتہ vk لفظ کی ابتدا میں بھی استعمال ہوتا ہے لیکن اس صورت میں اس کے یعنی ’ا‘ کے اوپر ایک علامت لگ جاتی ہے جس کو علامت ’د‘ کہتے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ درمیانی حالت اور آخری حالت میں طویل مصوتہ ’vk‘ لکھنے کے لیے علامت ’د‘ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ علامت صرف ابتدائی حالت میں vk لکھنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ ہاں عربی کے کچھ الفاظ ایسے ضرور ہیں جن میں درمیانی حالت میں بھی ’ا‘ پر ’د‘ کی علامت لگائی جاتی

ہے۔ جیسے قرآن، ماب، مال وغیرہ۔ اور ایسا اس لیے کرنا پڑتا ہے کہ ان لفظوں کے دونوں رکن پڑھے جائیں۔ اگر ان لفظوں میں 'ا' کے اوپر 'ہ' کا استعمال نہ ہو تو یہ قرآن، ماب، اور مال پڑھے جائیں گے جو غلط تلفظ ہوگا۔

نیم مصوتہ (Semi Vowel)

اردو میں دو نیم مصوتے ہیں: 'و' اور 'ی'۔ انہیں نیم مصوتہ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ دونوں حروف مصمتہ CONSONANT کے طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے وصال، عضو، نحو، یہ، یاد، یقین وغیرہ۔

نیم مصوتہ 'و'

جب 'و' کسی لفظ یا صوت رکن کی ابتدائی حالت میں آتا ہے تو یہ نیم مصوتہ ہوتا ہے مثلاً وار، وسعت، واحد، وصال وغیرہ۔ اور 'و' پر اعراب یعنی زبر، زیر، پیش بھی لگتا ہے۔ درمیانی حالت میں 'و' مصوتہ اور مصمتہ دونوں حیثیتوں سے آتا ہے۔ مصوتے کی حیثیت سے اس کی مثالیں اوپر چارٹ میں دی جا چکی ہیں۔ مصمتے کی حیثیت سے اس کی مثالیں حسب ذیل ہیں:

مصوّر، ساوّن، تصوّف وغیرہ۔

آخری حالت میں بھی 'و' مصمتے (Consonant) کے طور پر استعمال ہوتا ہے جیسے عضو، نحو، وغیرہ۔

ی،ے: 'و' کی طرح 'ی' بھی نیم مصوتہ کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً یہاں، یاد، اہمیت، کیا، کیوں، یقین، تعین، تخیل وغیرہ (مصمتوں کی طرح یہ حرف بھی اعراب قبول کرتا ہے) ی/ے آخری حالت میں صرف مصوتہ ہوتی ہے۔ جیسے بکری، لکڑی، بکڑی وغیرہ۔

حروف تہجی

اردو رسم خط میں کل ۳۶ حروف ہیں۔ اردو

کے بعض قاعدوں میں ۳ دیے گئے ہیں اور کسی کسی میں ۳۸ بھی۔ ان میں 'ء' اور 'لا' کو بھی حرف کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ اردو میں چونکہ ہمزہ اپنی آواز نہیں دے پاتا، اس لیے اسے حرف نہ مان کر

اردو میں دس مصوتے ایسے ہیں جو لکھے جاتے ہیں یعنی جن کے اظہار کی علامات موجود ہیں۔ ویسے اردو میں دس سے زیادہ مصوتے ہیں۔ مثلاً 'احسان' لفظ میں جو ابتدائی مصوتہ ہے وہ 'ا' اور 'آ' سے مختلف ہے۔ یعنی اس لفظ کو 'Ahsas' بولتے ہیں اور نہ ہی 'Ahsas' بلکہ ان دونوں کے درمیان کی آواز بولی جاتی ہے جس کے اظہار کے لیے اردو میں کوئی علامت موجود نہیں ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی مصوتے ہیں جن کے لیے اردو میں علامات نہیں ہیں۔ ایسی آوازوں کے تحریری اظہار کے لیے قریبی علامت کا سہارا لیا جاتا ہے یا ان کی جگہوں کو یوں ہی چھوڑ دیا جاتا ہے جیسے 'سنٹر'۔

بعض لوگ اس لفظ کو 'سینٹر' لکھتے ہیں کیونکہ 'ے' قریبی مصوتہ ہے اور بعض لوگ اس لفظ میں 'ے' نہیں لکھتے کیونکہ اس کے لکھنے سے اس لفظ کا تلفظ 'سینٹر' ہو جاتا ہے جو صحیح نہیں کیونکہ 'س' اور 'ن' کے درمیان کی آواز 'اے' کی نہیں بلکہ 'اے' اور 'ا' کے بیچ کی آواز ہے۔ چونکہ اس بیچ کی آواز کے لیے اردو میں کوئی علامت موجود نہیں ہے اس لیے ایسی صورت میں کوئی قریبی علامت لکھنے کے بجائے یوں ہی چھوڑ دینا زیادہ مناسب رہے گا۔

ایک اطلاقی علامت کے طور پر استعمال کرنا زیادہ مناسب ہوگا اور لا کا تو جواز ہی نہیں بنتا۔ اردو حروف تہجی کا ایک چارٹ نیچے دیا جا رہا ہے جس میں حروف کو

ان کی شکل کی بنیاد پر مختلف گروپوں میں تقسیم کر کے دکھایا گیا ہے۔ اس تقسیم سے اردو رسم خط پڑھانے میں آسان ہو سکتی ہے۔

ا
ب، پ، ت، ٹ، ث
ج، چ، ح، خ
د، ڈ، ذ
ر، ز، ر، ژ
س، ش
ص، ض
ط، ظ
ع، غ
ف، ق
ک، گ
ل
م
ن
و
ہ
ی/ے

اوپر کے چارٹ پر غور کرنے سے یہ اندازہ ہوگا کہ ایسے حروف کو ایک گروپ میں رکھا گیا ہے جن کے درمیان کوئی نہ کوئی ایک بنیادی علامت موجود ہے مثلاً 'ب' گروپ کے تمام حروف 'ب' علامت مشترک ہے۔ ORTHOGRAPHY کی اصطلاح میں یہ علامت GRAPHEME کہلاتی ہے۔ اس طرح کی ایک مشترک COMMON علامت ہر گروپ کے تمام حروف میں موجود ہے۔ بس یہ علامت (GRAPHEME) لفظوں اور 'ط' کی مدد سے مختلف حروف میں تبدیل ہو گئی ہے۔

اردو رسم الخط کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے حروف لفظ بنانے میں انگریزی کی طرح الگ الگ

استعمال نہیں ہوتے بلکہ وہ ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں اور ایسی صورت میں بعض حروف ٹوٹ جاتے ہیں اور عام طور پر لفظ بنانے میں زیادہ تر حروف کی ٹوٹی ہوئی شکلیں ہی استعمال ہوتی ہیں۔ یہ ٹوٹی ہوئی شکلیں حروف کی ALLOGRAPHIC SHAPES کہلاتی ہیں۔ حروف کے ALLOGRAPHIC SHAPES صرف لفظ کے ابتدائی اور درمیانی حالتوں میں ہی استعمال ہوتے ہیں۔ لفظ کے آخر میں 'حرف' اپنی پوری شکل میں آتا ہے۔ جیسے بات، تاج، شخص وغیرہ۔ لیکن اردو کے سبھی حروف نہیں ٹوٹتے کچھ حروف ایسے بھی ہیں جو ابتدائی، درمیانی اور آخری تینوں حالتوں میں اصلی روپ یعنی پوری شکل میں ہی آتے ہیں۔ یہ حروف حسب ذیل ہیں:

ا، د، ڈ، ذ، ز، ژ، زو،

ہائے مختفی:

جب کسی لفظ میں ہ کی آواز پوشیدہ ہوتی ہے اور اس کی آواز مصوتہ vk کی طرح سنائی دیتی ہے تو وہ وہاں ہائے مختفی ہوتی ہے۔ جیسے پردہ، تحفہ، جلوہ، راستہ، جذبہ، سلسلہ، خدشہ، پ، نہ، یہ، کہ وغیرہ۔ ہائے مختفی کی صرف ایک ذیلی علامت ہے جو لفظ کے آخر میں استعمال ہوتی ہے اور وہ علامت یہ ہے۔ □۔ لفظ کے آخر میں ہ کی اصلی یعنی پوری شکل بھی استعمال ہوتی ہے جیسا کہ اوپر کی مثالوں میں دکھایا گیا ہے۔ ایسے ہندی الفاظ جو زیر ختم ہوتے ہیں ان میں بھی ہ مختفی کی یہ شکل "س" استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً: راجیہ، بھارتیہ، ساہتیہ وغیرہ۔

دو چشمی ھ

اردو میں معکوسی آوازوں کی طرح ہا کاری آوازیں (Aspirated Sounds) بھی بولی جاتی ہیں۔ مثلاً بھ پھ تھ جھ وغیرہ۔ ان آوازوں کو اردو میں لکھتے وقت دو چشمی ھ کی علامت استعمال کی جاتی ہے۔ ھ کی مدد سے بننے والے حروف اردو میں مرکب یا مخلوط حروف کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ تعداد میں پندرہ

ہیں۔ مثلاً بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، رھ، ڈھ، کھ، گھ، لھ، مھ، ٹھ۔ نیچے ایک چارٹ دیا جا رہا ہے جس میں ان حروف کا استعمال لفظوں میں بھی دیکھا جاسکتا ہے:

بھارت، پھر، تھا، ٹھگ،

تھوٹ، چھوٹ،

دھار، ڈھکن،

گیارھواں، گڑھ،

کھال، گھر،

لوٹھا

تمھارا، ننھا

اردو رسم خط کی کچھ اور خاص باتیں

حروف نیچے کے علاوہ اردو میں کچھ ایسی علامات و اعراب بھی ہیں جن کا اردو زبان کے لکھنے میں اہم رول ہوتا ہے۔ جن میں زیر، زبر، پیش، مد، ہمزہ، تہن، تشدید، جزم، غنہ، دو چشمی ھ، واؤ معدولہ، واؤ عطف، اضافت مارکر، "ال" کی اضافت کھڑا زبر۔ کھڑی زیر خاصے اہم ہیں۔

ہمزہ: عربی زبان میں 'ء' ایک حرف ہے اور اس کی اپنی آواز ہے لیکن اردو میں یہ ایک المائی علامت کی حیثیت سے استعمال ہوتا ہے اور اس کی اپنی آواز نہیں ہوتی۔ ہمزہ 'ء' کا استعمال ایسی صورت میں ہوتا ہے جب کسی لفظ میں دو مصوتے (Vowels) (طویل خفیف) ایک ساتھ بولے جائیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ 'ء' اردو میں Vowel Sequence کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ایک ساتھ جب دو مصوتے آتے ہیں تو دوسرے مصوتے کے اوپر ہمزہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً گئے، جاؤ، نئے، جائے، کئی وغیرہ۔

تہن: ایک عربی طریقہ ہے جو اردو میں بھی رائج ہے بلکہ یہ اردو املاء کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ جب

کسی لفظ پر دو زبر، دو زیر یا دو پیش (ُ ِ) لگاتے ہیں اور اس کی آواز نون کی نکلتی ہے تو اسے تہن کہتے ہیں۔ ِ ِ کا استعمال اسم اور صفت کو متعلق فعل بنانے کے لیے ہوتا ہے۔

اردو میں دو طرح کی تہن زبر اور تہن زیر استعمال ہوتی ہے۔ تہن زبر استعمال نہیں ہوتی ہے۔ یہ صرف ایک لفظ میں دیکھنے کو ملتی ہے جیسے مثلاً الیہ۔ تہن زیر بھی بہت کم استعمال ہوتی ہے۔ محض چند لفظوں میں اس کا استعمال ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثلاً نسل بعد نسل۔

لیکن تہن زبر اُعام طور پر استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً فوراً، عموماً، اتفاقاً، جواباً، اصولاً، بشرائناً، رسماً، خصوصاً، مجبوراً، غالباً وغیرہ۔

تہن کے استعمال کا قاعدہ یہ ہے کہ لفظ کے آخر میں الف "ا" جوڑ دیتے ہیں اور اس پر دو زبر لگا دیتے ہیں جیسے

اتفاق : اتفاقاً

شرارت : شرارتاً

وقت : وقتاً

جبر : جبراً

ہ مختفی پر ختم ہونے والے الفاظ میں "ہ" کو ت سے بدل دیا جاتا ہے اور پھر اس کے آگے ا جوڑا جاتا ہے۔ مثلاً:

ارادہ : ارادتاً

اشارہ : اشارتاً

نتیجہ : نتیجتاً

واقعہ : واقعۃً

ہ مختفی والے لفظوں میں تہن لگانے کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ ہ کو تائے مدورہ ۃ میں بدل دیتے ہیں اور اس کے اوپر دو زبر لگا دیتے ہیں۔ جیسے اشارۃً ارادۃً۔ اس کی دوسری شکل یہ بھی ہے: دفعۃً، کنایۃً نتیجتاً، واقعۃً وغیرہ

تشدید ۲

تشدید کا لفظی معنی ہے شدت پیدا کرنا۔ جب کسی آواز میں شدت پیدا کرنی ہوتی ہے یعنی اس کو دوبارہ بولنا ہوتا ہے تو اس آواز کو لکھنے میں تشدید کی مدد لی جاتی ہے۔ جیسے: بچہ، کٹا، بلی، رشی، شدت، جدت، محبت، عزت وغیرہ۔

جزم ۷

یہ علامت اس وقت استعمال کی جاتی ہے جب دو مصوتے (CONSONANTS) بغیر کسی مصوتہ (VOWEL) ایک ساتھ آئیں۔ مثلاً تَحْت، تَحْت، بَرَق، بَرَق، لَفْظ وغیرہ۔ ان لفظوں میں آخری دو حروف CONSONANTS ہیں اور ان دونوں کے درمیان کوئی مصوتہ نہیں ہے۔ اگر اس علامت کا استعمال نہ کیا جائے تو لفظوں کو تَحْت، تَحْت، بَرَق، بَرَق، لَفْظ پڑھے جانے کا امکان بنا رہے گا جس کا غلط تلفظ ہوگا۔ یہ علامت اس وقت بھی استعمال کی جاتی ہے جب جڑواں مصوتے (DIPHTHONG) استعمال میں آتے ہیں۔ جیسے اُور، ائی، اُوراق، ایسا، کینسی وغیرہ۔

نون غنہ ۸

لفظ کے آخر میں آنے والے مصوتہ (Vowel) کو Nasalised کرنے کے لیے اس علامت کا استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً زباں، بیاں، جہاں، آسماں، گلستاں، ماں، دھواں وغیرہ۔ جب کبھی لفظ کے درمیان میں مصوتے (Vowel) کو NASALISED کرنا ہوتا ہے تو اس وقت بھی نون غنہ کا استعمال ہوتا ہے لیکن اس وقت اس کی شکل بدل جاتی ہے۔ اس کی شکل نون کے اس ایلوگرافک شہیپ کی طرح ہو جاتی ہے اور نون سے فرق کرنے کے لیے اس پر الٹا جزم کا نشان بنا دیتے ہیں یعنی اس طرح کا نشان ۷۔ کچھ لوگ اس نشان کی جگہ جزم کی علامت ۰ کا استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً: جنگ، انگ، سانس، پینک وغیرہ۔

واو معدولہ

وہ و جو لفظ میں لکھا جاتا ہے، پڑھا نہیں جاتا، اسے و او معدولہ کہتے ہیں۔ جیسے خواب، خواہش، خواجہ، خوار، درخواست، خدا، خواستہ، خوان، خود، خوش، خودی، خورشید، خوشامد، خویش، خودی وغیرہ۔

ان تمام لفظوں میں و کی حیثیت و او معدولہ کی ہے۔ عام طور پر و او معدولہ فارسی لفظوں میں آتا ہے مگر بعض ہندوستانی لفظوں میں بھی و او معدولہ لکھا جاتا ہے اور پڑھا نہیں جاتا۔ جیسے ہوئی، ہوا، ہوا، اونی وغیرہ۔

واو عطف

و لفظوں (دو اسم یا دو صفت یا ایک اسم اور ایک صفت) کو آپس میں جوڑنے کا بھی کام کرتا ہے۔ اس صورت میں و و او عطف کہلاتا ہے مثلاً شمس و قمر، راز و نیاز، خورد و کلاں، نیک و بد، خیر و شر وغیرہ۔

اضافت:

اضافت کے لفظی معنی ہیں نسبت، علاقہ۔ ایک لفظ کا علاقہ (تعلق) جب دوسرے لفظ سے دکھانا ہوتا ہے تو اضافت کا استعمال ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اضافت دو اسموں یا اسم اور صفت کے درمیان کا، کی اور کے کے معنی دیتی ہے اردو اور ہندی میں دو لفظوں کا تعلق کا، کی اور کے سے دکھاتے ہیں لیکن عربی اور فارسی کے لفظوں کے ساتھ یہ تعلق اضافت کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ اردو زبان نے فارسی کے اس طریقے کو بھی اپنا لیا ہے۔ مثلاً: لَحْتِ جگر، نورِ نظر، وقتِ شام، زندگیِ بیمار، پردہٴ غفلت، صدائے بازگشت، بوئے گل، کوئے محبوب، سُوئے دار وغیرہ۔ اردو میں تین طرح کی اضافتیں پائی جاتی ہیں:

۱۔ اضافتِ زیر،

۲۔ اضافتِ ہمزہ،

۳۔ اضافتِ یائے مہوز 'ئے'

اضافتِ زیر

عام طور سے مصوتوں (Consonants) پر ختم

ہونے والے لفظوں میں زیر کی اضافت استعمال ہوتی ہے۔ جب مرکب لفظوں میں پہلا لفظ مصمتی حرف پر ختم ہو رہا ہو تو اس حرف کے نیچے زیر کی اضافت لگائی جاتی ہے مثلاً رازِ گل، شامِ گل، آبِ حیات، موجِ دریا، دروِ جگر، شامِ غم وغیرہ۔

اگر مرکب الفاظ میں پہلا لفظ "ع" پر ختم ہو رہا ہو تو اس حرف کے نیچے اضافتِ زیر استعمال ہوتی ہے جیسے متاعِ دل، شعاعِ امید، نوعِ انساں، بطولِ سحر، شمعِ محفل وغیرہ۔ اگر مرکب لفظوں میں پہلا لفظ "ی" پر ختم ہو رہا ہو تو اس حرف کے نیچے بھی اضافتِ زیر (-) استعمال ہوگی جیسے بربادیِ چمن، زندگیِ بیمار، وادیِ طور، کرسیِ صدارت، مرضیِ مولا، خوبیِ قسمت، روشنیِ چراغ وغیرہ۔ بعض لوگ "ی" پر ختم ہونے والے پہلے لفظ پر اضافتِ ہمزہ ء مثلاً ترقیِ ملک، خوبیِ تقدیر وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں صحیح نہیں ہے۔

نوٹ:

کسی حرف کے نیچے اضافتِ زیر لگانے سے اس حرف کا تلفظ اے یعنی مصوتہ اے ہوتا ہے۔

اضافتِ ہمزہ

جب کسی مرکب لفظ کا پہلا لفظ ہ مخفی پر ختم ہو رہا ہو تو ہ/ یا اس کی ذیلی شکل کے اوپر اضافتِ ہمزہ کا استعمال ہوتا ہے مثلاً جلوہٴ محبوب، پردہٴ راز، قطرہٴ خون، خانہٴ خدا، جذبہٴ دل، کوچہٴ یار، حلقہٴ زنجیر، شیشہٴ دل وغیرہ۔ ہمزہ لگانے سے ہ مخفی کی آواز vk میں بدل جاتی ہے۔ یہاں ایک بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اگر چھوٹی ہ لفظی ہو یعنی ہ کی آواز دے رہی ہو تو اس کے نیچے اضافتِ زیر استعمال ہوگی۔ مثلاً آہِ مظلوم، راہِ وفا، کوہِ طور وغیرہ۔

اگر مرکب لفظوں کا پہلا حرف یائے مہجول "ئے" پر ختم ہو رہا ہو تو اس حرف کے اوپر بھی اضافتِ ہمزہ لگائی جاتی ہے۔ جیسے شئےِ لطیف، مئے

صاف وغیرہ۔

اضافیت یا 'مہوز' کے

مرکب الفاظ میں پہلا لفظ جب 'ا' (vk) اور 'و' (mw) پر ختم ہو رہا ہو تو اس کے آگے یا 'مہوز' کی علامت 'ے' لگا دیتے ہیں مثلاً صدائے وطن، نوائے مرغ، سزائے موت، تماشائے دنیا، بونے گل، آرزوئے دوست، آبروئے یار وغیرہ۔

نوٹ

اگر 'و' پہلے لفظ کے آخر میں Semi Vowel کے طور پر آ رہا ہو تو اس کے نیچے اضافیت زیر استعمال ہوگی۔ مثلاً جزوبدن، عضو خاص، مجوخیال وغیرہ۔

ال: 'ال' عربی زبان میں اضافت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ یہ اضافت اردو کے ان مرکب الفاظ میں ہوتی ہے جن کا آغاز عربی ہے۔ یہ اضافت بھی دو اسموں میں علاقہ پیدا کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے جس کے معنی ہیں 'کا، کی، کے'۔ اردو میں اس اضافت کا تلفظ دو طرح سے ادا ہوتا ہے۔ ایک میں 'ل' کی آواز سنائی دیتی ہے۔ مثلاً خورشید الاسلام، دار الحکومت، بیت الغزل، ملک الموت، حب الوطن، عید الفطر، یوم الحساب، بین الاقوامی وغیرہ۔

اردو دوسری میں 'ل' کی آواز معدوم ہوتی ہے یعنی سنائی نہیں دیتی جیسے در السلطنت، عبدالصمد، عبدالرحمن، نظام الدین، قمر الزماں، دار الشفا، توبۃ النصوح وغیرہ۔ تلفظ کے نقطہ نظر سے 'ال' کی اضافت والے مرکب لفظوں کو دو خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ ایسے مرکب الفاظ جن میں 'ال' کا تلفظ نہیں ہوتا ہے۔
۲۔ اور وہ مرکب الفاظ جن میں 'ال' کا تلفظ ہوتا ہے۔

۱۔ اگر مرکب لفظوں کا دوسرا لفظ 'ت، ط، د، ث، س، ص، ذ، ز، ض، ظ، ش، ل، ر، اور ن Consonants سے شروع ہوتا ہے تو یہ حروف مشہور ہوجاتا ہیں اور ان کی آوازیں پہلے لفظ کی آخری آواز سے جڑ جاتی ہیں اور پہلے لفظ کے

آخری حرف پر پیش لگ جاتا ہے تو ایسے مرکب لفظوں میں 'ال' کا تلفظ نہیں ہوتا۔ مثلاً دار السلام، فخر الدین، دار الشفا، تحف الشری، قمر الزماں، سلیم الطبع، محمد اللہ، توبۃ النصوح، مافی الضمیر وغیرہ۔

۲۔ اگر مرکب لفظوں کا دوسرا لفظ مذکورہ بالا حروف کے علاوہ باقی حروف سے شروع ہوتا ہے تو یہ حروف مشہور نہیں ہوتے اور ایسے لفظوں میں 'ل' کا تلفظ ہوتا ہے مثلاً دار الحکومت، عید الفطر، حب الوطن، شیخ الجامعہ، عبدالقادر، ابوالکلام، فارغ البال، بین الاقوامی، یوم الحساب، ملک الموت وغیرہ۔

نمبر ایک والے حروف جن کی آوازیں دینی ہوتی ہیں، حروف شمسی کہلاتے ہیں اور نمبر دو والے باقی حروف یعنی ب، ج، ح، ع، غ، ف، ق، ک، م، و، حروف قمری کہلاتے ہیں۔ 'ال' اضافت کا اصول یہ ہوا کہ مرکب الفاظ کے لفظ کی ابتدا اگر شمسی حروف سے ہو رہی ہو تو ان لفظوں میں 'ل' کا تلفظ نہیں ہوگا اور قمری حروف سے اس کی شروعات ہو رہی ہو تو 'ل' کا تلفظ کیا جائے گا۔ 'ا' کسی بھی حالت میں نہیں پڑھا جائے گا۔ یعنی 'ا' کی آواز دونوں صورتوں میں خاموش ہوگی۔ 'ال' کا استعمال انگریزی کے The (Article) کے معنی میں بھی ہوتا ہے جیسے الکتاب، الرسول، البیان، الکلام وغیرہ۔

کھڑا زبر (چھوٹا الف)

اردو میں بعض لفظوں پر عربی قاعدے کے مطابق کھڑا زبر (چھوٹا الف) استعمال ہوتا ہے جس کی آواز، طویل مصوبہ vk کی طرح ہوتی ہے مثلاً موسیٰ، عیسیٰ، لہذا، حتیٰ، معزیٰ، اعلیٰ، ادنیٰ، رحمن وغیرہ۔

کھڑی زیر

اردو میں کھڑی زیر کا استعمال طویل مصوبہ bz کے لیے ہوتا ہے جیسے باریک، شہر، تصویر وغیرہ۔ مگر یہ علامت کچھ لفظوں میں مصمتی حروف (Consonants)

Letters) کے نیچے بھی دکھائی دیتی ہے جیسے مشہور ہے، بعینہ وغیرہ۔

اردو میں استعمال ہونے

والے اعراب و علامت کا چارٹ

اعراب اور علامت	نشان	علامت	
زبر	ˆ	ˆ	تخلص کی علامت: میر، اقبال،
زیر	˘	ع	مصرعہ کی علامت: کوئی مصرعہ نقل کرنے سے پہلے یہ علامت لکھتے ہیں
پیش	ˆ		
تشدید	ˆ	ˆ	شعر لکھنے سے قبل یہ علامت استعمال کی جاتی ہے
مد	ˆ	ص	صفحے کے لیے
جزم	ˆ	ع	علیہ السلام
النا	ˆ	ع	رحمۃ اللہ علیہ
جزم نون	ˆ	ع	
غند کیلئے	ˆ	ع	
ہمزہ	ˆ	ع	عدد کا مخفف۔ نمبر شمار کے لیے: ۱۰، ۹، ۱۰
دو چشمیہ	ˆ	ع	عیسوی کا مخفف: ۱۹۸۱ء
تنوین	ˆ	ع	هجری کا مخفف: ۱۳۲۰ء
کھڑا زبر	ˆ	ع	قبل مسج: دو سو سال قبل مسج
کھڑی زیر	ˆ	ع	رقم، تاریخ یا وزن کے ہندسے کے بعد آڈی لکیر: ۲/ مارچ
	ˆ	ع	صلی اللہ علیہ وسلم کا مخفف: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

□□□

اردو کی تدریس میں اجتہاد کی ضرورت



نہال الدین عثمانی

208 ریورویو پارٹمنٹ، تملک مارگ، لکھنؤ

موبائل: 9559479229

ریختہ کی ملک اور بیرون ملک مقبولیت۔ خود میرے اردو تدریس کے بعض ویڈیوز تین لاکھ سے زائد افراد دیکھ چکے ہیں۔ ہمیں ان مہمانوں کو اردو کی جانب متوجہ کرنا ہے تو درس و تدریس کے اپنے روایتی طریقے میں ترمیم کرنا ہوگی اور رسم الخط میں بھی اصلاح کرنا ہوگی۔ ابھی جب ہم اردو پڑھانا شروع کرتے ہیں تو ہمارا زور اس بات پر ہوتا ہے کہ پہلے الف سے تک تمام

ناواقف کسی عربی یا فارسی داں کے لئے اردو کے چند جملے بھی صحیح طریقے سے پڑھ پانا ممکن نہیں ہے۔ ایک سے زائد رسم الخط کے موضوع پر ہم اسی مضمون میں آگے بات کریں گے۔

ہم جب یہ کہتے ہیں کہ اردو سیکھنے والوں کی تعداد مسلسل کم ہو رہی ہے تو ہم اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ موجودہ حالات کے سبب اگرچہ اردو کا

کہا جاتا ہے کہ ایک جھوٹا اگر ۱۰۰ بار بولا جائے تو وہ سچ ہو جاتا ہے۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ جب ہم کوئی بات بار بار کہتے یا سنتے رہتے ہیں تو ہم اس جھوٹ پر خود بھی یقین کرنے لگتے ہیں۔ ایسا ہی ایک بہت زیادہ بولا جانے والا جھوٹ یہ ہے کہ اردو ختم ہو رہی ہے۔ ایسا ہمیں اس لئے لگتا ہے کہ ہم نے اپنے گرد و پیش کے ماحول کو آنکھ کھول کر دیکھا ہی نہیں۔

حروف یاد ہو جائیں، تب آگے بڑھا جائے۔ اس طرح حروف یاد کرنے میں وقت بہت لگتا ہے۔ اسے دلچسپ بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم نے اولین دو حروف یعنی 'الف' اور 'ب' بتا دئے ہیں تو ہمیں 'اب' اور 'آب' بھی لکھنا سکھا دینا چاہئے۔ اس طرح حروف جلد یاد ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ حروف نجفی کے تمام حروف شروع

منسلکات - ۱					
ب	پ	ت	ث	ث	ج
b	p	t	ṭ	ṭ	dʒ
چ	ح	خ	د	ذ	ج
č	h	x	d	ḏ	z
ر	ز	ز	س	س	ش
r	z	z	s	s	ʃ
ص	ض	ط	ع	ع	غ
s	z	ṭ	ʔ	ʔ	y
ف	ق	ک	ل	ل	م
f	q	k	l	l	m
ن	و	و	گ	گ	نگ
n	v	v	g	g	ng

آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا کہ اب سے چالیس سال پہلے تک اردو کی تخلیقات کا ہندی میں ترجمہ ہوتا تھا لیکن اب ترجمہ کے بجائے صرف رسم الخط بدل دیا جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ادبی ذوق رکھنے والا ہندی داں طبقہ بھی اب کافی اردو سمجھنے لگا ہے۔ اس کی ایک اور وجہ بھی ہے جس کی طرف ہمارا دھیان گیا ہی نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ اردو اب ایک ایسی زبان ہے جس کے دور رسم الخط ہیں۔ ایک فارسی

میں ہی ترتیب وار سکھانے پر زور نہ دیا جائے۔ پہلے ایسے حروف کا انتخاب کیا جائے جن سے زیادہ سے زیادہ لفظ بن سکیں۔ اب نے 'ب' لکھنا سکھا دیا تو اس کے بعد 'ذ' لکھنا سکھا سکتے ہیں، اس طرح نئے الفاظ ادب، آداب اور داد لکھنا سکھا یا جاسکتا ہے۔ اس کے

روایتی حلقہ اس میں کم دلچسپی لے رہا ہے لیکن اس کے دائرہ میں بڑی تعداد میں اب وہ لوگ آ رہے ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ یہ لوگ اردو کے فروغ میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ اس کی مثال ہے جناب سنجیو صراف کی rekhta.org اور جشن

اور دوسرا دیوناگری۔ کم و بیش یہی بات گاندھی جی نے ہندوستانی کی وکالت کرتے ہوئے کہی تھی کہ ایک ایسی زبان جس کے دور رسم الخط ہوں۔ حالانکہ اردو رسم الخط کو اب فارسی کہنا درست نہیں ہے کیونکہ اس میں اتنی ترمیمات اور اضافے ہو چکے ہیں کہ اس زبان سے

بعد ہم 'س' لکھنا سکھا کر دس لکھنا سکھا سکتے ہیں۔ ہم پوری حروف تہجی ترتیب وار سکھانے کا کام بعد میں بھی کر سکتے ہیں۔

آسان رسم الخط کو چینی زبان کے تصویری رسم الخط میں بدل دیا۔ جب کہ چین میں اب اسکولوں میں بچوں کو روایتی چینی رسم الخط کے ساتھ ہی 'ہن ہن' یعنی رومنائز

الخط کی اہمیت قطعاً کم نہیں ہوئی ہے۔ اسی طرح ہمارا یہ سوچنا بھی غلط ہے کہ اگر ایک بڑا طبقہ اردو زبان کو ہندی یا انگریزی رسم الخط میں لکھنے لگا ہے تو اس سے اردو رسم

الخط سیکھنے میں لوگوں کی دلچسپی ختم ہو جائے گی۔ پنجابی زبان کے بھی دو رسم الخط ہیں۔ ایک گرومکھی اور دوسرا شاہ مکھی جو بعض پنجابی زبان کی آوازوں کے ساتھ ترمیم شدہ اردو رسم الخط ہی ہونے کی وجہ سے پنجابی زبان پر تو کوئی اثر نہیں پڑا بلکہ یہ امر دلچسپ ہے کہ پٹیالہ یونیورسٹی کے پنجابی بی اے آنرز کے پہلے سال میں ہی شاہ مکھی رسم الخط بھی سکھایا جاتا ہے۔

مناسکات ۲

Arabic consonants													
IPA	Value	Name	Final	Medial	Initial	Isolated	IPA	Value	Name	Final	Medial	Initial	Isolated
[ʔ]	ʔ	ʔ	ض	ض	ض	ض	[ʔ]	ʔ	ʔ	ا	-	-	ا
[b]	b	bā'	ب	ب	ب	ب	[b]	b	bā'	ب	ب	ب	ب
[t]	t	tā'	ط	ط	ط	ط	[t]	t	tā'	ت	ت	ت	ت
[θ]	θ	ṯā'	ظ	ظ	ظ	ظ	[θ]	θ	ṯā'	ث	ث	ث	ث
[ʕ]	ʕ	'ayn	ع	ع	ع	ع	[ʕ]	ʕ	ʕayn	ع	ع	ع	ع
[g]	g	ghayn	غ	غ	غ	غ	[g]	g	ghayn	ج	ج	ج	ج
[h]	h	hā'	ح	ح	ح	ح	[h]	h	hā'	ح	ح	ح	ح
[x]	x	khā'	خ	خ	خ	خ	[x]	x	khā'	خ	خ	خ	خ
[d]	d	dāl	د	-	-	د	[d]	d	dāl	د	-	-	د
[ð]	ð	dhāl	ذ	-	-	ذ	[ð]	ð	dhāl	ذ	-	-	ذ
[r]	r	rā'	ر	-	-	ر	[r]	r	rā'	ر	-	-	ر
[z]	z	zāy	ز	-	-	ز	[z]	z	zāy	ز	-	-	ز
[s]	s	sā'	س	س	س	س	[s]	s	sā'	س	س	س	س
[ʃ]	ʃ	shā'	ش	ش	ش	ش	[ʃ]	ʃ	shā'	ش	ش	ش	ش
[ʕ]	ʕ	sād	ص	ص	ص	ص	[ʕ]	ʕ	sād	ص	ص	ص	ص

Arabic vowels
short vowels (a, i, u) and the diacritics attached to the long vowels are usually written only in poetry, textbooks for foreign learners, children's books and the Qur'an (Koran)

ب ب ب ب ب ب ب
bā bi bā bu bi bā b

Arabic numerals with number names in Standard Arabic

۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷ ۸ ۹ ۱۰
عشرة تسعة ثمانية سبعة ستة خمسة أربعة ثلاثة اثنان واحد

ہم جب بچوں کو اردو پڑھانا شروع کرتے ہیں تو انہیں لفظ لکھنا سکھاتے نہیں بلکہ الفاظ کی شکلیں رٹا دیتے ہیں۔ الفاظ کی شکلیں جب ہم رٹائیں گے تو ظاہر ہے کہ انہیں بے شمار الفاظ کی شکلیں رٹانا پڑیں گی۔ ہم قلم کی ججے بتاتے ہیں کہ ق زبر ق، ل م قلم یعنی لکھتے ہیں قلم اور تلفظ کرتے ہیں قلم۔ ظاہر ہے کہ ججے اور تلفظ میں کوئی تال میل ہی نہیں ہے لیکن بچے

اردو سیکھنے والوں کو سب سے زیادہ دقت لفظوں کے صحیح ججے میں پیش آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم 'ث، س اور ص' کا تلفظ 'س' کی طرح، 'ز، ذ، ض، ظ' کا

رسم الخط بھی سکھایا جاتا ہے۔ جس طرح چینی زبان 'ہن ہن' (یعنی بعض ترمیموں کے ساتھ انگریزی حروف) میں لکھی جانے لگی ہے لیکن اس سے چینی زبان کے رسم

نے چونکہ لفظ کی پوری شکل ہی ذہن نشین کر لی ہے اس لئے وہ بار بار مشق کرنے کے بعد اسے لکھنے تو لگا ہے لیکن لفظ سمجھ نہیں سکا ہے۔ اس طرح ہم نے ایک

تلفظ 'ز' کی طرح، ح اور ہ کا تلفظ 'ہ' کی طرح اور 'ز' اور الف کا تلفظ 'الف' کی طرح کرتے ہیں۔ دراصل ان سبھی حروف کے تلفظ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ہم نے الفاظ تو عربی زبان سے لئے ہیں اور ان کی جڑ بھی عربی زبان کے مطابق ہی رکھی ہے لیکن تلفظ کے معاملے میں ہم نے ہندی پر اصرار کیا ہے۔ ہندی میں 'ٹ' اور 'ص' کے لئے نہ تو کوئی الگ حروف اور نہ ہی آوازیں ہیں چنانچہ ہم ان کا تلفظ 'س' یعنی ہندی کے 'स' کی طرح کرتے ہیں۔

منسلکات ۳									
خ	ح	ج	چ	ٹ	ث	پ	ب	ا	آ
kh	ch	ch	ch	ṭ	ṭ	p	b	ā	ā
kh	ch	ch	ch	ṭ	ṭ	p	b	ā	ā
[x]	[ç]	[tʃ]	[dʒ]	[ʈ]	[ʈ]	[p]	[b]	[ɑː]	[ɑː]
ض	ص	ش	س	ز	ذ	ر	ڑ	ل	ळ
ẓ	ẓ	ʃ	s	z	z	r	ṛ	l	ḷ
ẓ	ẓ	ʃ	s	z	z	r	ṛ	l	ḷ
[z]	[z]	[ʃ]	[s]	[z]	[z]	[r]	[ɾ]	[l]	[ɭ]
ث	س	ک	ق	ف	غ	ع	ظ	ط	ظ
ṭ	s	k	q	f	gh	ʿ	ẓ	ṭ	ẓ
ṭ	s	k	q	f	gh	ʿ	ẓ	ṭ	ẓ
[ṭ]	[s]	[k]	[q]	[f]	[ɣ]	[ʕ]	[z]	[ṭ]	[z]
ی	ہ	و	و	ی	ی	ی	ی	ی	ی
y	h	w	w	y	y	y	y	y	y
y	h	w	w	y	y	y	y	y	y
[j]	[h]	[w]	[w]	[j]	[j]	[j]	[j]	[j]	[j]

سے بولتے ہیں۔ اسی طرح 'ٹ'، 'س' اور 'ص' کے لئے ایک ہی علامت 'S' ہے یعنی یہ تینوں آوازیں بھی ایک ہی ہیں۔ 'ذ'، 'ز'، 'ص' اور 'ظ' کے لئے بھی ایک ہی علامت 'Z' ہے یعنی یہ چاروں آوازیں ایک ہی ہیں۔

عربی زبان میں ان حروف کی آوازیں یکساں نہیں بلکہ مختلف ہیں مثلاً (منسلکات - ۲) 'ث' کیلئے 'θ' کے لئے 'S' اور 'ص' کے لئے 'S' علامات کا استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح 'ض' کے لئے 'ذ' کے لئے 'θ' کے لئے 'S' اور 'ز' کے لئے 'Z' کا استعمال ہوتا ہے۔ بعض لوگ 'ز' کا تلفظ 'ز' کی طرح کرتے ہیں جب کہ کافی اردو داں اور انگریزی داں حضرات 'ز' کا صحیح تلفظ کر سکتے ہیں۔ یہ حرف فارسی سے آیا ہے اور اس کی آواز وہی ہے جو انگریزی میں Television کے 'S' یعنی 'ز' کی ہے۔ اس کی بین الاقوامی صوتی علامت (منسلکات - ۳) 'z' ہے۔ اردو میں ہم 'ض' کا تلفظ 'ز' کی طرح کرتے ہیں مثلاً رمضان کو رمضان بولتے ہیں۔ ادھر کچھ عرصہ سے بعض لوگ رمضان کا تلفظ رمدان کرنے لگے ہیں حالانکہ ایسے لوگوں کی تعداد ابھی بہت کم ہے۔ یہ طبقہ اسلامی شناخت کا مطلب عربی شناخت سمجھتا ہے۔ ایسے لوگوں کو سمجھ لینا چاہئے کہ عربی میں 'ض' کا تلفظ 'ذ' نہیں ہے کیونکہ عربی میں 'ض' کی بین الاقوامی صوتی علامت (منسلکات - ۲) 'd' اور 'ذ' کی علامت (منسلکات - ۳) سے آیا ہے اور فارسی میں اس کی صوتی علامت 'Z' ہے۔

رومن کی توہین کی شکل ہیں اور ان کے ذریعہ تلفظ کے نازک سے نازک فرق کو بھی سائنسی صحت سے واضح کیا جاسکتا ہے۔

اردو حروف کی آوازوں کیلئے جو 'IPA' علامات وضع کی گئی ہیں، ان میں (منسلکات - ۱) 'ط' اور 'ث' کے لئے ایک ہی علامت 'ṭ' ہے یعنی یہ دونوں آوازیں ایک ہی ہیں کیونکہ ہم ان دونوں کو اردو میں ایک ہی طرح

تلفظ برقرار رکھا ہے، ان کی ادائیگی کے لئے ہندی رسم الخط میں بھی بعض کے نیچے نقطہ لگا کر 'ق'، 'ز'، 'ف'، 'خ' کے لئے 'क', 'ख', 'फ', 'ख' وغیرہ حروف تشکیل دئے گئے ہیں۔

پنجابی زبان والے تو اس معاملے میں ہندی والوں سے بھی چند قدم آگے نکل گئے ہیں۔ انہوں نے ان آوازوں کے لئے جن حروف کے نیچے نقطہ لگایا ہے انہیں باقاعدہ اپنے حروف تہجی میں ہی شامل کر لیا ہے۔ چنانچہ گرومکھی رسم الخط میں (منسلکات - ۴) 'ف'، 'خ'، 'ز' وغیرہ کے لئے بھی حروف موجود ہیں۔



بقول گوپی چند نارنگ 'ارتقائی سفر کے دوران زبان کی پرانی آوازوں میں تبدیلیاں ہوتی ہیں اور ہر تاریخی موڑ پر نئی آوازیں داخل ہوتی ہیں۔ رسم الخط آوازوں کو علامتوں کے ذریعہ ظاہر کرنے کے کام آتا ہے۔ چنانچہ پرانی علامتیں منسوخ ہو جاتی ہیں اور نئی آوازوں کے لئے نئی نئی علامتیں اختیار کرنے کا عمل جاری رہتا ہے۔ جدید لسانیات میں تجرباتی کام کے لئے خواہ وہ کسی زبان سے متعلق ہوں

International Phonetic Alphabet یعنی بین الاقوامی صوتی علامتوں کا استعمال ہوتا ہے جو

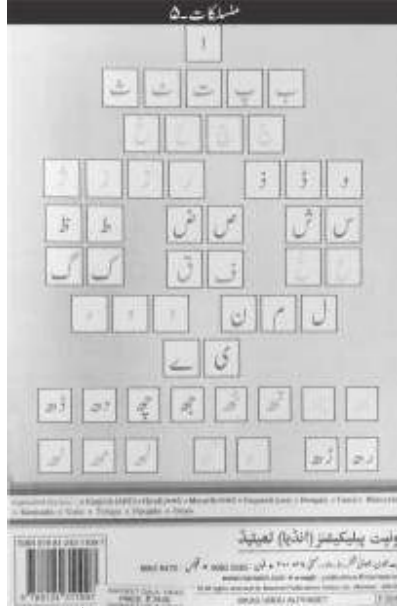
International Phonetic Alphabet

International Phonetic Alphabet

International Phonetic Alphabet

آواز ہے۔ جن لوگوں نے الفاظ کی شکلیں نہیں رٹی ہیں۔ انہیں یہ سمجھنے میں دقت ہوتی ہے کہ کسی لفظ میں 'س' کا استعمال کرنا ہے، یا 'ص' یا 'ث' کا استعمال کرنا ہے کیونکہ املاتو ہم عربی کی طرح لکھتے ہیں جب کہ تلفظ اس طرح نہیں کرتے ہیں۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ 'ث'، 'ص' اور 'س' ان تین حروف کی جگہ صرف 'س' استعمال کیا جائے کیونکہ بولتے تو ہم 'س' ہی ہیں۔ خواہ ہم 'ثانی' لکھیں، 'صلح' لکھیں یا 'سماعت' لکھیں۔ اسی طرح 'ط' اور 'ت' کی جگہ صرف 'ت' استعمال کرنا چاہئے۔ اس کے علاوہ 'ح' اور 'ھ' کی جگہ صرف 'ہ' یا 'ھ' کا استعمال کرنا چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ ہ اور ھ میں سے ہمیں ھ کو ترجیح دینا چاہئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کی متعدد شکلیں ہو جاتی ہیں مثلاً ہرا، مہمان، منہ وغیرہ جب کہ ھ کی شکل میں تبدیلیاں نہیں ہوتی ہیں۔ پھر سوال یہ پیدا ہوگا کہ ہکاری آوازیں ہم کیسے بنا سکیں گے تو اس کے لئے ہم 'ھ' کا استعمال اسی طرح کرتے رہیں گے جس طرح کر رہے ہیں۔ جہاں ہم 'ہ' کا استعمال کرتے ہیں وہاں تھوڑی ترمیم کرنا پڑے گی۔ اس 'ہ' کو ہم 'ھ' لکھ سکتے ہیں۔ مثلاً کھانے کے لئے تو کھانا ہی ہوگا لیکن کہنا کے لئے کھنا لکھ سکتے ہیں۔ متعدد ہم آواز حروف کی جگہ صرف ایک حرف کے استعمال پر بعض لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس ترمیم سے ہم وہ ادب نہیں پڑھ سکیں گے جو اب تک اردو میں تحریر کیا جا چکا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ ذرا غور کیجئے کہ اردو ہم سنیعتی میں لکھتے ہیں جب کہ اخبارات میں 'س' کا بھی کافی استعمال ہوتا ہے لیکن ہم اسے بھی پڑھ لیتے ہیں۔ آج ہمارے ہاتھ اگر اب سے ۵۰ سال پہلے کی ٹائپ سٹنگ میں چھپی ہوئی کتاب ہاتھ لگ جائے تو کیا ہم اسے نہیں پڑھ سکیں گے کیونکہ وہاں تو 'ت' کی جگہ 'ت' چھپا ہوگا۔

بات جب اردو ٹائپ کے حروف تک پہنچی ہے تو اردو حروف کے اب تک کے ارتقائی سفر پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔ اس سے ہم خود کو اردو رسم الخط



میں ترمیم کے بارے میں ذہنی طور پر تیار کر سکیں گے کیونکہ یہ کام کوئی ایک شخص نہیں کر سکتا اور نہ یہ محض چند ماہ کا کام ہے۔ ایرانیوں نے جب فارسی کو عربی رسم الخط میں لکھنا شروع کیا تو جو آوازیں عربی میں نہیں تھیں لیکن فارسی کا لازمی حصہ تھیں یعنی پ، چ، ژ اور گ ان کو ظاہر کرنے کے لئے عربی حروف میں ترمیم اور اضافہ کیا گیا



اور انہیں اپنے حروف تہجی میں شامل کر لیا۔ اسی طرح جب اردو کے لئے فارسی رسم الخط کا انتخاب کیا گیا تو ہمیں بھی ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا کیونکہ بعض مقامی آوازوں کو ظاہر کرنے کے لئے فارسی میں حروف موجود ہی نہیں تھے۔ ہندی کی آوازوں 'ٹ'، 'ڈ' اور 'ڑ' کو جب اس رسم الخط میں لکھنے کی ضرورت پڑی تو پہلے نقطوں سے کام لیا گیا چنانچہ 'ت' اور 'ڈ' پر چار چار نقطے لگائے گئے اور کسی نے ایک چھوٹی افقی لکیر پر دو نقطے لگائے۔ یہ چار نقطے کس طرح ختم ہوئے، اس کی بھی دلچسپ تاریخ ہے۔ دشواری یہ ہوتی تھی کہ لکھنے کی چھپائی میں یہ نقطے جھڑ جاتے تھے اور لفظ کچھ کا کچھ بن جاتا تھا مثلاً 'ت' کا 'ٹ' ہو جاتا تھا۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے ان حروف پر چار نقطوں کی جگہ اردو میں چار کا عدد یعنی ۴ لکھنا شروع کر دیا۔ اس میں دشواری یہ تھی کہ قومات اور دیگر اعداد کے ساتھ مل جاتا تھا۔ پھر کچھ لوگوں نے اس ۴ کو الٹا لکھنا شروع کر دیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ چھوٹی 'س' 'ط' کی شکل اختیار کر گیا۔ اسی طرح اردو میں ہکاری یا ہائے آوازیں یعنی بھ، بھ، بھ، بھ، بھ، بھ، بھ، بھ، بھ، بھ، وغیرہ موجود ہیں۔ انہیں لکھنے کا مسئلہ بھی شروع میں رہا اور انہیں 'ہ' کے بجائے 'ھ' سے لکھا جاتا رہا۔ غالب سبھی 'کھانا' اور 'کھانا' کو ایک ہی طرح سے لکھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ ہائے آوازوں کے لئے 'ھ' لکھنے کا رواج ہو گیا۔ ابھی اگر چہ بھ، بھ، بھ وغیرہ مخلوط حروف ہی تصور کئے جاتے ہیں، انہیں اردو حروف تہجی میں آزادانہ مکمل حروف تسلیم نہیں کیا جاتا لیکن انہیں حروف تہجی میں شامل کرنے کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ Oxford Urdu English میں 'ب' کے بعد 'بھ' اور 'پ' کے بعد 'بھ' سے شروع ہونے والے الفاظ کا اندراج ہے۔ نویت پبلی کیشنز (منسلکات-۵) کے اردو کے ابتدائی قاعدہ میں 'ے' کے بعد ہکاری مخلوط حروف کا اندراج ہے۔ اس لئے دیر سویر یہ حروف بھی اردو حروف تہجی کا باقاعدہ حصہ ہوں گے۔

...بقیہ صفحہ ۴۶ پر



مرزا اسد اللہ خاں غالب
۱۷۹۷ء - ۱۸۶۹ء

غزل

باز بچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگ سلیمان میرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز میا مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبین خاک پہ دریا مرے آگے
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے
سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں
بیضا ہے بت آنکھ سیرا مرے آگے
پھر دیکھے انداز گل افشانی گفتار
رکھ دے کوئی پیمانہ صہبا مرے آگے
ایمان مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے
عاشق ہوں پہ مستوق فریبی ہے مرا کام
مجھوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ میرے آگے
ہے موجزن اک قلم خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے
گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے
ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود ہیں ہیں کہ ہم



غالب یعنی سب پر غالب۔ غالب سے پہلے اردو کی کلاسیکی شاعری میں عاشق کا تصور سراپا نیاز رہنے کا تھا۔ محبوب کے آگے
دیا اور محبوب سے اپنے وجود کے احساس کے ساتھ ملنے اور اس سے برابری گفتگو کا نیا خاکہ پیش کیا، اس حد تک کہ ان کے متعدد
یوں تو غالب کے یہاں معروضی طور پر تصوف بھی ملتا ہے جو دراصل ان کی شخصیت کا حصہ نہیں بلکہ برائے بیت ہے۔ غالب
کلام غالب کی خوبی ہے جو ان کے پرستاروں کے سرچڑھ کر بولتی ہے۔ ان کی خودداری، خود پسندی اور انانیت ان کے کلام کی
میں جزوی طور پر اختیار کیا۔ اردو شہری سرمائے میں خودداری اور انانیت کی اساس کو غالب نے ایک نئی جہت سے روشناس کرا
حد تک عرفان صدیقی (۱۹۳۹ء-۲۰۰۳ء) کی شاعری میں نظر آتا ہے لیکن غالب سے بھی پہلے ہندوستانی ادب میں کبیر (۳۰۰
نے خدا کی ذات سے جس انداز میں گفتگو کی، زندگی کے مکروہات کا جس بے نیازی سے مذاق اڑایا اور نام نہاد طلسمی طاقتوں کو
نمایاں اوصاف ہیں۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب میں کبیر اور غالب جیسی خودداری، خود پسندی اور انانیت پائی
زبانوں کے ادب کے اردو ترجمے کیاب ہیں لیکن ہندی ادب میں بکیتی بودھ (۱۹۱۷ء-۱۹۶۳ء) کے علاوہ، دھول (۱۹۳۶ء-۱۹۵۰ء)
کچھ کچھ جا ملتا ہے۔ غالب کی ۲۳۰ ویں یوم ولادت کے موقع پر انہیں بطور خراج اسی خراج کے ۲۲ منتخب اشعار اور ایک غزل پیش

پھر آنے کے بعد اگر روانہ ہوا



سر تسلیم خم کر دینے کا چلن عام تھا۔ مکمل پردگی کے اس تصور کو غالب نے توڑ
شعرا اعلیٰ کے اشعار کہلائے۔

بہ خدا سے بھی گفتگو کرتے ہیں تو خودی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ یہی تو
وہ سب سے نمایاں خوبی ہے جسے ان کے بعد علامہ اقبال نے اپنی شاعری
یا جس کا کس کسی حد تک دور حاضر میں شجاع خاور (متوفی ۲۰۱۲ء) اور ایک
۱۲-۱۵۱۸ء) کے یہاں یہ خودداری اور انایت بدرجہ اتم موجود تھی۔ کبیر
اس جراثیم انداز سے چیلنج کیا، کم و بیش یہی سب تو غالب کی شاعری کے
جاتی ہے یا نہیں، اس پر ہم سب خاموش ہی رہتے ہیں کیونکہ ہندوستانی
۱۹۷۷ء) کا شعری ذوق بھی غالب کی خودداری، خود پسندی اور انایت سے
ش کی جا رہی ہے۔ (ایڈیٹر)

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈیو یا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

بکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناقص
آدی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

ہیں اور بھی دنیا میں سنو بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز عیاں اور

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

قرض کی پیتے تھے لیکن بگھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاتحہ مستی ایک دن

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پچھانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لوح جہاں پہ حرف مکر نہیں ہوں میں

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جسکو ہودین و دل عزیزا سکی گلی میں ہائے کیوں

غالب بحث کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روپے زار زار کیا کیجئے ہائے کیوں

واں وہ غرور مجر و ناز، یاں یہ جناب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں

بندگی میں بھی وہ آزاد و خود ہیں، کہ ہم
اٹکے پھر آئے، در کعبہ اگر دا نہ ہوا

وہ اپنی خون چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سرنگے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ظہرا
تو پھر اے سنگدل ترا ہی سنگ آستان کیوں ہو

کھلا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

زندگی اپنی جب اس شکل میں گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے باایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

لازم نہیں کہ حنجر کی ہم بیرونی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سز ملے

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
دعا تھا ہے اپنے عالم تقریر کا

تھا زندگی میں مرگ کا کلکا لگا ہوا
اڑنے چھتر بھی مرا رنگ زرد تھا

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تھے ہم ولی بگھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اردو رسم الخط کا ایک مسئلہ حروف کے جوڑوں کا بھی ہے۔ نستعلیق میں جوڑوں کی تعداد خاصی زیادہ ہے۔ اسی وجہ سے نستعلیق کا کوئی اطمینان بخش ٹائپ رائٹر نہیں بن سکا تھا۔ اس وجہ سے بھی اردو کو کافی نقصان پہنچا لیکن یہ مسئلہ کمپیوٹر کے استعمال سے کافی حد تک حل وہ چکا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ایک زمانہ میں اردو کا رسم الخط تبدیل کرنے کے لئے بہت سے لوگ وکالت کرتے تھے جو خاص طور پر اردو کی طباعت اور ٹائپنگ میں دشواری کی وجہ سے تھی۔ اب ایسا کوئی

مسئلہ نہیں ہے۔ اب اردو سیکھنے والوں کا مسئلہ حروف کے جوڑوں کی تعداد بہت زیادہ ہونا ہے۔ مثلاً 'ب' کی مختلف شکلیں دیکھئے: باب، بہت، بحر اور بستی۔ اس کی صرف دو شکلوں سے ہی کام چل سکتا ہے یعنی باب، بیس، بحر، بھوک، سب۔ اس طرح صرف اور صرف 'ب' اور 'بے' سے کام چل گیا۔

ہم 'ڈاؤر ڈ' سے پہلے کسی حرف سے ملاتے ہیں تو اس کی شکل 'زاور ز' جیسے ہو جاتی ہے جسے کچھنے میں دقت ہوتی ہے۔ آخر ہم مدد کو مدد اور مذاق کو مذاق کیوں نہیں لکھ سکتے تاکہ 'ڈاؤر ڈ' آسانی سے پہچان میں آسکیں۔ اسی طرح 'ک' کے بعد 'الف' یا 'ل' آتا ہے تو اس کی شکل 'ک' کیوں کر دیتے ہیں۔ کاف اور گاف کی شکل کو گول بنانے کا طریقہ تو ازبیک زبان میں رائج تھا۔

(منسلکات ۶) جس کا رسم الخط ہی اب تبدیل ہو چکا ہے۔ اسی طرح 'ڈاؤر ڈ' کو 'زاور ز' کی طرح لکھنے کا طریقہ بھی ہم نے قدیم ازبیک رسم الخط سے ہی لیا ہے۔ اسی طرح ج، چ، ح وغیرہ جب کسی لفظ کے

درمیان میں آتے ہیں تو ان کی شکل 'م' جیسی ہو جاتی ہے۔ یہ طریقہ بھی نہ عربی میں رائج ہے اور نہ فارسی

منسلکات ۷

خش	khwāsh, khwāsh (page 483)
خوسیدن	khūsidān
خوسیدن	khūsidān. To dry up, shrivel; to be wrinkled; to be moist; to flow from the eyes (humour); to collect.
خوش	khwāsh, khwāsh
خوش	khwāsh, khwāsh. Good, sweet, excellent, beautiful, fair, charming, pleasant, delightful, agreeable, cheerful, amiable, lovely, delicate, tender, kind, gentle, humane, mild, meek, elegant, healthy, whole-some.
خوش	khwāsh, khwāsh (page 483)
خوسیدن	khūsidān
خوسیدن	khūsidān. To dry up, shrivel; to be wrinkled; to be moist; to flow from the eyes (humour); to collect.
خوش	khwāsh, khwāsh
خوش	khwāsh, khwāsh. Good, sweet, excellent, beautiful, fair, charming, pleasant, delightful, agreeable, cheerful, amiable, lovely, delicate, tender, kind, gentle, humane, mild, meek, elegant, healthy, whole-some.

میں۔ یہ شکل بھی ازبیک رسم الخط سے ہی لی گئی ہے۔ فارسی اور عربی میں تو ان حروف کی شکل (منسلکات ۱۰/۹) 'م' جیسی ہوتی ہے۔ اس قسم کے تجربات پہلے بھی ہوتے رہے ہیں۔ جو بعد میں زبان کا لازمی جز بن گئے مثلاً عربی زبان میں 'ا'، 'آ' ہے۔ ہم نے اردو میں اس سے دو حروف بنائے۔ 'ا' اور 'آ'۔ اب ان دونوں کا الگ الگ استعمال ہے۔ اسی

منسلکات ۸

وجه الرئيس الأمريكى، دونالد ترامب، تحذيرا شديد اللهجة الى زعيم كوريا الشمالية، كيم جونج أون، بشأن برنامج بيونغيانغ النووي
وقال ترامب في خطاب ألقاه أمام البرلمان الكوري الجنوبي: "لا نستهيئوا بنا، لا تختبرونا"، منددا بحياة "الوهم والرعب" في كوريا الشمالية.
وتوجه الى كيم جونج أون قائلا إن "الأسلحة التي تجمعها لن توفر لك سلامة أكثر، وتجعل نظامك في خطر كبير".

طرح 'ہ اور ہ' ایک ہی حرف کی دو مختلف شکلیں ہیں لیکن ہم ان سے دو الگ الگ کام لینے لگے۔ یہی حال 'ی' اور 'ے' کا ہے جو ایک ہی حرف کی دو الگ الگ شکلیں ہیں۔ ہم ان کا جو استعمال اردو میں کر رہے ہیں۔ وہ

عربی میں ہے ہی نہیں۔ ہم بعض الفاظ میں الف مقصورہ استعمال کرتے ہیں جیسے علیحدہ، زکوٰۃ، رحمن، فتویٰ، استغنیٰ، استعیل وغیرہ۔ ان کی جگہ علاحدہ، زکات، رحمان، فتوا، استعفا، استعیل وغیرہ لکھ سکتے ہیں۔ ہمیں ان الفاظ کو بلا وجہ عربی الماکی طرز پر لکھتے رہنے کی ضد نہیں کرنا چاہئے۔

اردو الما کا ایک مسئلہ تلفظ سے متعلق بھی ہے۔ یعنی کسی لفظ کا پہلے جو تلفظ تھا وہ رفتہ رفتہ بدل گیا لیکن اس کی سچے وہی لکھی جاتی رہی۔ مثال کے طور پر لفظ خوش کے تلفظ میں پہلے 'و' کی آواز شامل تھی لیکن اب 'واؤ' کا تلفظ نہیں ہوتا ہے لیکن اس کی جے میں آج بھی واؤ شامل ہے۔ دیکھئے ۱۹۱۱ء میں شائع ہونے والی F.T. Steingass کی A Comprehensive Dictionary of Persian-English (منسلکات ۷) جس میں 'خوش' میں واؤ کا تلفظ بھی دکھایا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ 'خوش' یا 'خواب' جیسے الفاظ میں جب واؤ کا تلفظ ہوتا ہی نہیں ہے تو انہیں جاری رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔

ہم صرفی اور نحوی خصوصیات پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ کسی زبان کے سرمایے میں اضافہ کرنے اور نئی اصلاحات گڑھنے میں سابقوں اور لاحقوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ اردو میں ایسی یا مقامی سابقوں اور لاحقوں کے ساتھ عربی فارسی لاحقے بھی استعمال کئے جاسکتے ہیں مثلاً لپ سڑک۔ اس انفرادیت نے اردو کے دامن کو بہت وسیع کر دیا ہے۔ زبان کوئی جامد چیز نہیں ہے۔ یہ ہر دور کے حالات کے پیش نظر تہذیبیاں قبول کرتی رہتی

سیکھنے کے اب بہتر اور مزید مواقع دستیاب ہیں اور جو لوگ اردو پڑھنا سیکھ چکے ہیں، انہیں مشق کے لئے کافی مواد دستیاب ہے۔ سوشل میڈیا پر اردو کی موجودگی سے اب اردو زبان کا احیاء ہوا ہے۔

یوٹیوب پر میرے ہی ویڈیوز کے ذریعہ اردو سیکھنے والے ہزاروں طلباء اب فیس بک پر بھی ہیں اور وہاں اردو پھر پورے طریقے سے موجود ہے۔ اردو کی موجودگی سے فرق کیسے پڑتا ہے، اس کے چند واقعات یہاں درج کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ایک این آر آئی جناب بگل مہتا جو امریکہ میں مقیم ہیں، انہوں نے یوٹیوب پر میرے ویڈیوز سے اردو سیکھی تھی۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے سوال کیا کہ انہیں اردو سیکھنے کا شوق کیسے پیدا ہوا۔ انہوں نے کہا کہ پہلے انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ اردو کا اپنا الگ رسم الخط ہے۔ ایک بار وہ ممبئی میں فرنچیز کی دکان پر گئے تو دکاندار ایک اخبار پڑھ رہا تھا۔ دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ یہ اردو زبان کا اخبار ہے۔ تب سے انہیں شوق پیدا ہوا کہ اردو رسم الخط بھی سیکھنا چاہئے۔ اسی طرح ہریانہ کے ایک صاحب نے بتایا کہ ان کے محلہ میں ایک سبزی فروش کو میں اکثر اردو کا اخبار پڑھتے ہوئے دیکھتا تھا تو مجھے لگا کہ جب یہ سبزی والا اردو پڑھ سکتا ہے تو میں کیوں نہیں سیکھ سکتا۔ چنانچہ انہوں نے اردو سیکھنا شروع کی۔ اسی طرح یہ سوچنا غلط ہے کہ اگر اردو ادب دیوناگری میں شائع ہونے لگا ہے تو اس سے اردو رسم الخط میں لوگوں کی دلچسپی ختم ہو جائے گی۔ اب فیس بک اور یوٹیوب پر لوگوں کے تبصروں سے آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ اردو سے دلچسپی اس طبقہ میں بھی کافی بڑھی ہے جس کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ کمپیوٹر اور سوشل میڈیا کی وجہ سے اردو رسم الخط کے مٹ جانے کا خطرہ توٹل گیا ہے لیکن ہماری ذمہ داری ہے کہ اس کی درس و تدریس کو آسان تر بنانے کے لئے کوشاں رہیں۔

□□□

دہلی کی قدیمی ترین سلاح
بشر مقابل سوسک ہاست۔ اینطور کہ
تحقیقات باستان شناس ہانسون می دہ،
انسان های اولیه یک میلیون سال قبل،
دہلی دو برای کشتن سوسک اختراع
کرده بودن و چند قرن بعد تازه فهمیدن
کہ می شه پوشیدش۔
وقتی سوسکی دہلی می خورہ تو
سروش، چہ می شه و لنگ ہاش می رہ
ہوا و بی حرکت می مونه۔ اما گول
نخورین، نود درصد مواقع، خالی بندہ و
طرف دارہ فیلم می آد۔ فهمیدن این
قضیہ آسونہ: یہ پر مرغ بردارین و شکم
سوسکہ رو قفلک بدین۔ سوسک ہا
خیلی قفلکی ان، طاقت ندارن و
غش غش می خندن۔ اون وقت محکم
بزنین تو سروش نارینش دریناد۔

اردو اب ایک ایسی زبان ہو گئی ہے جس کے دور رسم الخط ہیں۔ دراصل اس زبان کا ایک رسم الخط رومن بھی ہو گیا ہوتا لیکن کمپیوٹر اور سوشل میڈیا کی وجہ سے اس کی رفتار سست پڑ گئی ہے۔ سوشل میڈیا کی وجہ سے لوگوں کو اردو



ہے۔ اس سے الفاظ کے معنی ہی نہیں بدلتے ہیں بلکہ کئی بار ایک زبان کے فقرے دوسری زبان میں آنے پر الفاظ کی طرح استعمال ہونے لگتے ہیں۔ فارسی کا ایک فقرہ دیکھئے 'چڑھی گوئی'؟ یہ اردو میں آیا اور واحد سے جمع بن کر 'چڑھی گوئیاں' ہوا اور ایک لفظ کے طور پر استعمال ہونے لگا۔ عربی کے لفظ 'طیر' (پرندہ) کی جمع ہے طائر لیکن طائر اردو میں واحد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ غالب نے بھی 'طائران آشتیاں' گم کردہ کی ترکیب استعمال کی ہے۔ فارسی میں 'شادی' 'خوشی' کے معنی میں استعمال کیے ہیں۔ فارسی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح دو میں 'نبیاء' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح شراب عربی میں مشروب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جب کہ اردو میں اس کا مطلب نشہ آور مشروب سے ہے۔ بہت سے لفظوں کے دوسری زبان میں جانے پر تلفظ بھی بدل جاتے ہیں۔ مثلاً عربی کا لفظ موسم اردو میں موسم ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ اس پر بھند ہیں کہ عربی و فارسی کے الفاظ انہیں معنی و تلفظ کے ساتھ اردو میں بھی استعمال کئے جانا چاہئے۔

دعا تر یہ کیفی نے ایسے ہی لوگوں کے لئے کہا تھا: 'لوگوں کا مذاق کچھ ایسا بگڑ گیا ہے کہ بے ضرورت اور بے محل کلام میں غیر مانوس لغات عربی، فارسی اور سنسکرت کے ٹھونسے جاتے ہیں۔ اگر پنڈتائی اور مولویت کا زعم ذہن شریف پر ایسا ہی مسلط ہو گیا ہے تو عربی، فارسی اور سنسکرت میں خامہ فرسائی کیوں نہیں فرمائی جاتی۔ بیچاری اردو کے گلے پر شمشیر اصفہانی اور فولاد ہندی کیوں لادی جاتی ہے۔'

انشاء اللہ خاں نے دو صدیوں قبل ہی 'دوریا نے لطافت' (منسلکات۔ ۱۰) میں ایک اصول وضع کر دیا تھا کہ جو لفظ اردو میں آ گیا ہے، چاہے کسی زبان کا ہو، اب اس کا مفہوم اور تلفظ اردو ہی کے حساب سے ہوگا خواہ اصل زبان کے حساب سے اردو میں کیا جانے والا استعمال غلط ہی کیوں نہ ہو۔

اس مضمون کے شروع میں ہم نے ذکر کیا تھا کہ



ڈاکٹر انور ادیب

ابراہیم منزل، صدی محلہ، آکس سول، مغربی بنگال
موبائل: 9933198483

اردو کی ابتدا اور ارتقاء کا مختصر جائزہ

اردو ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی چھاؤنی کے ہیں۔ بعد میں اس کے معنی ”در بار“ ہو گئے۔ اور سترہویں صدی میں درباری زبان فارسی سے اردو ہو گئی اور اردو معلیٰ کہلائی۔ پھر صرف اردو رہ گئی۔ اسے مغل بادشاہوں کی سرپرستی حاصل تھی۔

اردو کی ابتدا 1193 میں ہوئی۔ مسلمان پونے دو برس لاہور میں متمکن رہنے کے بعد ترکوں اور افغانوں کی قیادت میں دہلی اور نواح دہلی میں داخل ہوئے۔ دہلی کو اس وقت فوجی چھاؤنی کی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں ہندو اور مسلم قوموں کے میل جول (Interaction) سے جو زبان وجود میں آئی وہ اردو کہلائی۔

اردو کی ابتدا پر مختلف ماہر لسانیات نے مختلف نظر یہ پیش کیا ہے۔ جدید ماہرین لسانیات جن میں ڈاکٹر سنبھتی کار چٹرجی، جولیس بلاک بیس، ڈاکٹر مسعود حسین خان، ڈاکٹر شوکت سبزواری وغیرہ شامل ہیں، اردو کا ماخذ کھڑی بولی بتاتے ہیں۔

اردو زبان کی تاریخ کو مندرجہ ذیل تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ 1193 سے 1347ء: کھڑی بولی کا ادب۔ چودہویں صدی تک یہ صرف بول چال کی زبان تھی۔ اس میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ فخر الدین نظامی کی مثنوی ”کدم راؤ پدم راؤ“ اور اشرف کی مثنوی ”نوسر ہار“ اس وقت تک اردو شاعری میں سب سے قدیم ہیں۔

۲۔ 1347ء سے 1750ء: دکنی ادب۔ اردو دہلی اور اس کے نواح میں پیدا ہو کر جب دکن پہنچی تو دکنی کہلائی۔ اردو کا یہ قدیم ادب تیرہویں صدی عیسوی سے سترہویں صدی عیسوی تک دکن اور گجرات میں پروان چڑھتا رہا۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو میں باقاعدہ تحریر و انشاء آغاز دکن

1800ء سے 1857ء: شمال میں 1835 تک اردو نے سرکاری زبان کی حیثیت حاصل کر لی اور شمالی ہند کی سب سے وسیع اور اہم زبان بن گئی۔ چنانچہ انگریزوں نے ہندوستان پر حکومت کرنے کی خاطر اردو کی تحصیل کو لازمی قرار دیا۔ 1800ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا جہاں انگریزوں کو اردو سکھانے کا انتظام تھا۔ اس زمانے میں لاہور تا کلکتہ اور دہلی تا مینسور اردو ہندوں اور مسلمانوں دونوں کی اہم علمی، ادبی اور تعلیمی زبان بن گئی۔ یہ زمانہ اردو کی عام مقبولیت کا نقطہ عروج تھا۔ 1832ء سے 1835ء تک علوم و فنون کی کئی کتابوں کا ترجمہ ہوا۔

۳۔ 1800ء سے 1835ء: اردو نے سرکاری زبان کی حیثیت حاصل کر لی اور شمالی ہند کی سب سے وسیع اور اہم زبان بن گئی۔ چنانچہ انگریزوں نے ہندوستان پر حکومت کرنے کی خاطر اردو کی تحصیل کو لازمی قرار دیا۔ 1800ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا جہاں انگریزوں کو اردو سکھانے کا انتظام تھا۔ اس زمانے میں لاہور تا کلکتہ اور دہلی تا مینسور اردو ہندوں اور مسلمانوں دونوں کی اہم علمی، ادبی اور تعلیمی زبان بن گئی۔ یہ زمانہ اردو کی عام مقبولیت کا نقطہ عروج تھا۔ 1832ء سے 1835ء تک علوم و فنون کی کئی کتابوں کا ترجمہ ہوا۔

۴۔ 1835ء سے 1857ء: اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل کرنے کے بعد اردو کی شاعری اور ادب میں ترقی ہوئی۔ دکن اور گجرات میں اردو شاعری کا چرچا ہوا۔ حاتم اور مظہر جان جانا نے اصلاح زبان کی تحریک شروع کی جس کا مقصد جہاں اردو کو برج بھاشا، کھڑی اور ہریانی کے اثرات سے پاک کرنا تھا وہیں اردو کو فارسی کی اجارہ داری سے نجات دلا کر اردو شاعری (ریختہ) کو فروغ دینا تھا۔ اس طرح 1800ء تک ادبی اردو کا معیار متعین ہو گیا۔

۳۔ 1750ء سے 1800ء: دکنی ادب۔ اردو دہلی اور اس کے نواح میں پیدا ہو کر جب دکن پہنچی تو دکنی کہلائی۔ اردو کا یہ قدیم ادب تیرہویں صدی عیسوی سے سترہویں صدی عیسوی تک دکن اور گجرات میں پروان چڑھتا رہا۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو میں باقاعدہ تحریر و انشاء آغاز دکن

۴۔ 1800ء سے 1835ء: اردو نے سرکاری زبان کی حیثیت حاصل کر لی اور شمالی ہند کی سب سے وسیع اور اہم زبان بن گئی۔ چنانچہ انگریزوں نے ہندوستان پر حکومت کرنے کی خاطر اردو کی تحصیل کو لازمی قرار دیا۔ 1800ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا جہاں انگریزوں کو اردو سکھانے کا انتظام تھا۔ اس زمانے میں لاہور تا کلکتہ اور دہلی تا مینسور اردو ہندوں اور مسلمانوں دونوں کی اہم علمی، ادبی اور تعلیمی زبان بن گئی۔ یہ زمانہ اردو کی عام مقبولیت کا نقطہ عروج تھا۔ 1832ء سے 1835ء تک علوم و فنون کی کئی کتابوں کا ترجمہ ہوا۔

انگریزوں کے دور حکومت میں بہار سے جدید ہندی کی تحریک کا آغاز ہوا۔ انگریزی کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ اس سے اردو کی سرپرستی پر اثر پڑا لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء حالی، شبلی، محمد حسین آزاد اور نذیر احمد نے اپنی تخلیقات سے اردو کو مالا مال کیا جس سے اردو کو ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں کھڑا ہونے کا موقع ملا علمی سطح پر اردو زبان کو توسیع ہوئی اور مختلف مصنوعات پر نئی اصطلاحات وجود میں آئیں۔ 1900ء میں اردو زبان کو ہمہ گیریت حاصل ہو گئی لیکن بد قسمتی سے اسی زمانے میں اردو ہندی کی لسانی کشمکش کا آغاز ہوا۔ بنارس میں ناگری پر چارنی سبھانے اردو ہندی کے تنازع کو ہوا دی۔

۶۔ 1935ء سے 2014ء: 1937ء میں جب پہلی بار کانگریس وزراتیں صوبوں میں برسر اقتدار آئیں تو ان کے تعلیمی پروگرام کی تشکیل سے واضح ہو گیا کہ اب ہندی اور سنسکرت سے ہندوستانی قومیت کا اظہار ہوگا۔ نئی تعلیمی پالیسی میں اردو کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی جب کہ آزادی سے قبل اردو ہندوستان میں رابطے کی زبان (Lingua Franca) تھی۔

آزادی کے بعد اردو زبان لسانی تعصب کا شکار ہو گئی لیکن جب آزادی کے بعد قومی زبان کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے جب ارکان پارلیمنٹ کی رائے لی گئی تو اردو اور ہندی کے حق میں برابر ووٹ آئے۔ اس وقت کے اسپیکر ڈاکٹر راجندر پرساد نے اپنا ووٹ (کاسٹنگ ووٹ) ہندی کی حمایت میں دے کر ہندی کو قومی زبان کا درجہ دلایا۔ اس طرح اردو ایک ووٹ کی کمی سے قومی زبان بننے سے رہ گئی۔ اس سلسلے میں قومی اتحاد کے علم بردار گاندھی، جی کارویہ نہایت قابل تحسین رہا۔ انہوں نے قومی زبان کے تنازع کو ختم کرنے کے لئے ”ہندوستانی“ کا نظریہ پیش

کیا۔ کیوں کہ ”ہندوستانی“ اردو اور ہندی کے امتزاج کا خوبصورت نمونہ تھی جسے ہندو اور مسلمان دونوں بولتے اور سمجھتے تھے۔ انہوں نے ”ہندوستانی“ کو دیوناگری اور

1956ء میں ریاستوں کی تشکیل نو لسانی

بنیاد پر ہوئی۔ لیکن اردو کے حصے میں کوئی ریاست نہیں آئی۔ یہ ایک تکلیف دہ صورت حال تھی۔ اردو دوستوں کی جدوجہد جاری رہی یہاں تک کہ 1961ء میں تمام وزرائے اعلیٰ کی میٹنگ میں ایک سہ لسانی فارمولہ تیار کیا گیا۔ جس کے مطابق پہلی زبان کے طور پر اپنی مادری زبان کا پڑھنا، دوسرے نمبر پر جدید ہندوستانی زبان کو رکھا گیا تاکہ اردو داں طلباء علاقے کے اعتبار سے اردو کے ساتھ کوئی دوسری زبان سیکھ سکیں اور غیر اردو داں طلباء اردو سیکھ سکیں۔ تیسری زبان کے خانے میں کوئی غیر ملکی زبان رکھی گئی (اس سے سب سے زیادہ فائدہ انگریزی کو ہوا) لیکن افسوس اس مفید لسانی فارمولا پر دیانت داری سے عمل نہیں کیا گیا۔ اردو دوستوں کی مسلسل جدوجہد کے نتیجے میں 1989ء میں اتر پردیش راج بھاشا قانون میں ترمیم کر کے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ اس وقت کانگریس کی حکومت تھی مگر مارچ 1990ء میں ملائم سنگھ یادو کی قیادت میں سماج وادی برسر اقتدار آگئی لیکن ہندی پریمیوں کو سرکار کا یہ فیصلہ پسند نہیں آیا اور اتر پردیش ہندی سبھتہ ستمیلن نے الہ آباد ہائی کورٹ میں سرکار کے اس فیصلہ کے خلاف رٹ داخل کر دیا جسے کورٹ نے خارج کر دیا۔ اس طرح اردو کا دوسری سرکاری زبان کا درجہ برقرار رہا۔ لیکن الہ آباد ہائی کورٹ کے اس فیصلہ کو اتر پردیش ہندی سبھتہ ستمیلن نے 1997ء میں سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا۔ یہ کیس تقریباً 25 برسوں تک سپریم کورٹ میں زیر التوا رہا۔ آخر 4 ستمبر 2014ء میں سپریم کورٹ نے اپنے تاریخ ساز فیصلے میں اس رٹ کو خارج کر دیا اور یوپی میں اردو کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ برقرار رکھا۔ اب یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اردو کو تعلیمی نظام سے جوڑے۔ اور پرائمری سے اردو زبان کو لازمی قرار دے۔

1956ء میں ریاستوں کی تشکیل نو لسانی بنیاد پر ہوئی۔ لیکن اردو کے حصے میں کوئی ریاست نہیں آئی۔ یہ ایک تکلیف دہ صورت حال تھی۔ اردو دوستوں کی جدوجہد جاری رہی یہاں تک کہ 1961ء میں تمام وزرائے اعلیٰ کی میٹنگ میں ایک سہ لسانی فارمولہ تیار کیا گیا۔ جس کے مطابق پہلی زبان کے طور پر اپنی مادری زبان کا پڑھنا، دوسرے نمبر پر جدید ہندوستانی زبان کو رکھا گیا تاکہ اردو داں طلباء علاقے کے اعتبار سے اردو کے ساتھ کوئی دوسری زبان سیکھ سکیں اور غیر اردو داں طلباء اردو سیکھ سکیں۔ تیسری زبان کے خانے میں کوئی غیر ملکی زبان رکھی گئی (اس سے سب سے زیادہ فائدہ انگریزی کو ہوا) لیکن افسوس اس مفید لسانی فارمولا پر دیانت داری سے عمل نہیں ہوا۔

اردو دوستوں کی مسلسل جدوجہد کے نتیجے میں 1989ء میں اتر پردیش راج بھاشا قانون میں ترمیم کر کے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ اس وقت کانگریس کی حکومت تھی مگر مارچ 1990ء میں ملائم سنگھ یادو کی قیادت میں سماج وادی برسر اقتدار آگئی لیکن ہندی پریمیوں کو سرکار کا یہ فیصلہ پسند نہیں آیا اور اتر پردیش ہندی سبھتہ ستمیلن نے الہ آباد ہائی کورٹ میں سرکار کے اس فیصلہ کے خلاف رٹ داخل کر دیا جسے کورٹ نے خارج کر دیا۔ اس طرح اردو کا دوسری سرکاری زبان کا درجہ برقرار رہا۔ لیکن الہ آباد ہائی کورٹ کے اس فیصلہ کو اتر پردیش ہندی سبھتہ ستمیلن نے 1997ء میں سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا۔ یہ کیس تقریباً 25 برسوں تک سپریم کورٹ میں زیر التوا رہا۔ آخر 4 ستمبر 2014ء میں سپریم کورٹ نے اپنے تاریخ ساز فیصلے میں اس رٹ کو خارج کر دیا اور یوپی میں اردو کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ برقرار رکھا۔ اب یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اردو کو تعلیمی نظام سے جوڑے۔ اور پرائمری سے اردو زبان کو لازمی قرار دے۔

□□□

دونوں رسم الخطوں میں لکھنے کی تجویز پیش کی۔ (یہ کام انہوں نے جیل میں قیام کے دوران کیا) وہ اردو دوستوں کے خط کا جواب اردو میں دیتے تھے۔ لیکن افسوس گاندھی جی کے اس نظریے کو قبولیت حاصل نہیں ہوئی۔

بھوج پوری لوک دانش اور گلوبلائزیشن



ڈاکٹر خان محمد آصف

شعبہ اردو، گوتم بودھ یونیورسٹی، گریٹر نوبلیڈا
موبائل: 9650845746

والی دسمبر، جنوری کی سردی سچے دادی اور نانیوں کو گھیرے کہانی سنانے کی ضد کرتے ہیں، مانا کرتے دادیاں اور نانیاں آخر بچوں کی ضد کے آگے سرخم تسلیم کر کے کہتی اچھا پاندان لاؤ پان کھالوں تو شروع کرتی ہوں، اور نہ ختم ہونے والی کہانی شروع ہو جاتی، جس میں ہونکا رے کے ساتھ ساتھ نہ ختم ہونے والا تجسس و تیز و کیف کان ذالک موجود ہوتا۔ اب میں اس پاندان کا تصور کرتا ہوں تو وہ مجھے پنڈورا کا بکس معلوم پڑتا ہے، جس میں دیو، جن، کوہ، قاف کی پریاں، خطا و ختن کی شہزادیاں، عمرو عینا کی طلسماتی دنیا میں اور راجہ ہریش چند کی وفا شعاری اور ایمانداری، بہادری میں سہراب و رستم کے ساتھ آبلہ واودل کے قصے ہوتے۔ ان قصوں میں حق و باطل کی کشمکش اور خیر و شر کی رزم و بزم کا ذکر ہوتا اور حق و خیر ہمیشہ غالب آتا کیونکہ باطل کو ٹھنہ ہی تھا۔

بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوک روایتیں وقت گزاری اور ترقی طبع کے لیے ہیں۔ جب کہ یہ لوک کہانیاں ہمارے اجتماعی لاشعور اور لوک دانش کا حصہ ہیں۔ اس کے بنیادی کا اصل مقصد سماجی، معاشرتی اور اخلاقی اقدار کی تعلیم دینا ہوتا تھا، تاکہ اپنے اسلاف کے قصوں سے عبرت حاصل کر سکیں۔

جدیدیت کا سیدھا اثر گورپا، دادی نانی اور آنگن پر پڑا، ہم میں سے بہتوں کی دادی اور نانی تو اب رہی نہیں۔ ان کی تو صرف یادیں رہ گئی ہیں۔ ان یادوں کے سہارے ہم ان خوش نمادوں کو

کے تجربات کا قیمتی اثاثہ پوشیدہ ہے، اس کو بیان کرنے والے اب دھیرے دھیرے اس دار فانی سے کوچ کرتے جا رہے ہیں، اور جوچ گئے تھے انہیں نیوکلیر کی ماڈرن نسل نے انہیں اولڈ ایج ہوم میں ڈال دیا ہے، جس کی وجہ سے دادی نانی کی لوریوں اور دیکھ رکھ سے آنے والی نسل محروم ہے، لوک روایت تو نسل

مغربی کلچر کے اثر سے ہمارے ملک نے بھی پوپ کلچر، پوپ میوزک، ڈی۔ جے میں اپنے آپ کو بے خود اور سرشار کر لیا ہے۔ لوک ادب، لوک گیت، لوک کتھائیں جس میں ہمارا پورا تہذیبی و ثقافتی سرمایہ موجود ہے جس میں ہماری روایات اور برسوں کے تجربات کا قیمتی اثاثہ پوشیدہ ہے، اس کو بیان کرنے والے اب دھیرے دھیرے اس دار فانی سے کوچ کرتے جا رہے ہیں، اور جوچ گئے تھے انہیں نیوکلیر کی ماڈرن نسل نے انہیں اولڈ ایج ہوم میں ڈال دیا ہے، جس کی وجہ سے دادی نانی کی لوریوں اور دیکھ رکھ سے آنے والی نسل محروم ہے، لوک روایت تو نسل در نسل اور سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی ہیں۔

در نسل اور سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی ہیں۔ جس کا میں ایک ہانکا سا خاکہ پیش کرونگا کہ یہ لوک کتھائیں یا لوک گیت کس طرح ایک چبڑھی سے دوسری چبڑھی تک پہنچتے ہیں۔

برسات کے دن ہوں یا خون منجمد کر دینے

مغرب کا تہذیبی یلغار اور ایک لسانی فارمولا پوری دنیا کو ایک اکائی میں پرونا چاہتا ہے، تاکہ دنیا میں صرف ایک کلچر ایک ثقافت ایک زبان کا بول بالا رہے، اور بقیہ زبانوں اور ثقافتوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی وہ ناکام مگر مسلسل کوشش کر رہے ہیں، اگر ہم ابھی بھی خواب غفلت سے بیدار نہ ہوتے تو وہ دن دور نہیں جب ہم اپنی آنکھوں سے ان کے خوابوں کو شرمندہ تعبیر ہوتا ہونے دیکھیں گے کیونکہ ایک سروے کے مطابق دنیا کی ۶۵۰۰ زبانوں میں سے آدھی سے زیادہ ختم ہو گئی ہیں اور اعداد و شمار کے مطابق ایک زبان روز اپنا وجود کھور رہی ہے۔ یہ بات میں بڑے دکھ کے ساتھ لکھ رہا کہ ہمارا ہندستان زبانوں کا قبرستان بنتا جا رہا ہے۔

ہمارا موجودہ ہندوستانی سماج بڑی تیزی سے بینگنستان میں تبدیل ہو رہا ہے یہاں کی آبادی کا ۶۵ فیصدی حصہ ۱۸ سال سے ۳۵ سال کے نوجوانوں پر مشتمل ہے، جو بدن ڈھکنے سے زیادہ برانڈ پر زور دیتے ہے اسکی وجہ یورپی کلچر اور تہذیب ہے جو اپنی تمام عریانیت اور بے حیائی کو بڑے سلیقے سے مشتمل کر رہے ہیں۔

مغربی کلچر کے اثر سے ہمارے ملک نے بھی پوپ کلچر، پوپ میوزک، ڈی۔ جے میں اپنے آپ کو بے خود اور سرشار کر لیا ہے۔ لوک ادب، لوک گیت، لوک کتھائیں جس میں ہمارا پورا تہذیبی و ثقافتی سرمایہ موجود ہے جس میں ہماری روایات اور برسوں

یاد کر کے خوش ہو لیتے ہیں۔ زندگی میں بچھد کئے، چھپانے، چپکنے اور مسکرانے کے معنی ہم نے گوریوں سے سیکھا تھا۔ اور قدرتی مناظر سے جوڑنے کا راز بھی اسی ننھی مخلوق نے ہمیں دیا تھا، اب وہ ہم سے ناراض ہے اسی کئے ہوئے درخت، سوکتے ہوئے تالاب اور گھر سے لٹی اسٹوری بنی بلڈنگوں کا ملال ہے اب تو آنگن اپنے گھر ہی کے درمیان کہیں گم ہے، کوئی یہ کہہ بھی نہیں سکتا کہ میں تلسی تیرے آنگن کی کیونکہ بڑے اور کشادہ اپارٹمنٹوں کے درمیان دبا اور سکڑا آدمی تلسی اور آنگن کا تصور ہی نہیں کر سکتا ہے، اور نامائیں اپنے بچوں ان کے پیارے ماما اور اپنے بھائی سے اس طرح مخاطب کرا سکتی ہیں۔

چند انامادور کے
بابو کو دیکھیں گھور کے
لڈو موتی چور کے
آپ کھائے تھالی میں
بابو کو دیں پیالی میں
پیالی گئی ٹوٹ
بابو گیاروٹھ
اور پیالی لائیں گے
بابو کو منائیں گے

ساتھ کی دہائی میں ایک شور اٹھا تھا کہ اردو شاعری لایعنیت، ہملمیت اور اہامیت کا شکار ہے تو اردو فکشن میں بھی کہانی کی واپسی اور بیانیہ کی گمشدگی کا خوب رونا ریا گیا۔ لیکن ہم نے اپنے اندر میں ڈوب کر نہیں دیکھا، کہ یہاں بھی تو ایک غیر کتابی دنیا آباد ہے۔ ایسے مجھے جنوبی ہندستان کی لوک کہانی کی وہ بزرگ بڑھیا یاد آتی ہے جو اپنے گھر کی کچی سڑک پر ڈھونڈ رہی تھی۔

ایک اندھیری رات میں ایک بوڑھی عورت بڑے اٹھاک سے کچھ تلاش کر رہی تھی۔ ایک راگبیر

نے اس پوچھا۔ 'کیا آپ کا کچھ کھو گیا ہے؟'
اس نے جواب دیا۔ 'ہاں میں نے اپنی چھابیاں کھو دی ہیں اور شام سے انہیں تلاش کر رہی ہوں۔'

'آپ نے انہیں کہاں کھو یا تھا؟'
'مجھے کچھ نہیں معلوم۔ ہو سکتا ہے گھر کے اندر۔'
'تو پھر آپ انہیں یہاں کیوں ڈھونڈ رہی ہیں۔'

'کیونکہ اندر اندھیرا جو ہے، میرے دیئے میں تیل نہیں ہے۔ یہاں سڑک کی روشنی میں مجھے زیادہ اچھا نظر آسکتا ہے۔'

(لوک کہانیاں بھارت سے، مترجم طاہرہ حسن)
ہم روشنی کی کھوج میں گھر سے باہر تو نکلے لیکن گھر میں روشنی نہیں رہی، لیکن اب اپنی مطلوبہ کھوئی ہوئی شے کی تلاش میں گھر کے اندر جا رہے ہیں۔ گھر کے کلچرل اور ثقافتی دروازے کھول کر داخل ہو رہے ہیں۔ اس امید کے ساتھ کہ شاید چابی نہ ملے، لیکن اس کے آنگن اور چوہاروں میں بہت سی ایسی چیزیں بکھری پڑی ہیں، جن کے بارے میں ہمیں علم ہی نہیں کہ ہم نے کھو دی۔ لوک ادب اور لوک گیتوں کا تعلق بھی اسی گمشدہ چیز سے ہے جو صدیوں کے تجربات کا ورثہ ہیں، اور ہماری تہذیبی اور ثقافتی دانش کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ آج ہم کیوں نہ چہتیا، کبت، برہا، سوہرا اور شادی بیاہ کے موقعوں پر گائے جانے والے گیتوں کے بارے بات کریں، ان میں بھی تو ایک جیتی جاگتی، حرک دنیا آباد ہے۔ اس دنیا میں بھی چھیڑ چھاڑ کرتی لہر اور شوخ سہیلیاں، باہم کن پھسیاں کرتی بوڑھیاں، گھروں کے امن و چین کو غارت کرتی کتلیاں، جوانوں کو اپنی زلفوں کا اسیر بناتی دیکھتی پریاں۔ جس کی دو مثالیں میں صفدر خاں کے برہے سے ملاحظہ کریں۔

کھائے پان شان سے چلتی لالی لب پر چھائی رہی کرتے بات بتیسی جھلکیہ منسی دانٹ لگایے رہی چولی تنگ رنگ دار نار کے گولی میں فی رنگانے رہی صفدر کہیں ایک دن گوریا موہوں سے نین لڑائے رہی کتنے عاشق لگے گھات میں کتنن کے ترسانے رہی کیا کروں بیان نہی کرتی عقلمیا کام چنچل نارکی پھپت نہی چال (نیری) تریا چنچل جس دم گئی جل میں بل، عاشق گھتیا لگائے کھڑا رہا عاشق کھڑا گھات میں اوپر، بھیتر ہل گئی نار جی حیا سرم (شرم) اس دم سب چھوڑا، بولا جوان پکار جی بات بھولائی کیوں دل جانی کیوں لو، کول وکرار (قول وقرار) جی بچھ کے بات کھج گئی گوریا ج کے بھیئی انکار جی کہے کی اب ہٹ جاؤ یہاں سے، چاہو بھلا دھیجا جی (دھیجا ر ایک قسم کی گالی ہے)

کروں شور گر چور کے تو ان کھاؤ ابھی تو مار جی صفدر کہیں کھج کے بولی، گولی ہوگئی یار، عاشق گھتیا لگائے کھڑا رہا یہ بات میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ صفدر خاں کے اس برہے کی قرات سے قاری پر وہی سرور و سرشاری کی کیفیت طاری ہوتی ہے جو قلی قطب شاہ کی بارہ پیاریاں، میر حسن کی مثنوی سحرالبیان اور پنڈت دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم کی مثنویوں کو پڑھنے سے ہوتی ہے، کیونکہ ان کے موضوعات ایک ہیں اور آتش عشق کی آگ میں سبھی یکساں جل رہے ہیں۔ فرق صرف لفظیات، استعارات، تشبیہات اور عربی فارسی ترکیبات کا ہے، یہی تفریق موخر الذکر شعراء کو آفاقی و لافانی بناتی ہے، صفدر خان کی جو لفظیات اور تشبیہات ہیں، وہ ایک خاص دیہی خطے سے تعلق رکھتی ہیں، ان کی شاعری کا سیدھا رشتہ زمین سے ہے اس لئے ان کے تصورات اور تخیلات کا محور بھی وہاں کی رسمیات ہیں ان کے ذہن و گمان میں یہ بات نہیں آسکتی کہ ہونٹ اپنی نازکی میں گلاب کی پکھڑی کی طرح ہو سکتے ہیں اور لب کی صفت لعل و بدخشاں

پکی سڑک چارو طرف ہے، گھاٹ جنا مردانا چودا بگہا لمبا چوڑا نلکہ (نقشہ) دیکھا پورا نا دسہیں لگنے رام کا میلا، راون دیکھا بھہرانا رام، لکھن، ہنومن ہیں لڑتے مکر لڑنے دھنسن بانا گھٹ، نلکہ، سوالے (شوالے) باجیں جسے ہو پوجا کروانا برہا اپنے اندر ہندستان کی سا جھا سنسکرتی کی معمولی سی معمولی جزئیات کو سمیٹے ہوئے ہے۔ جو ہمیں اپنے اسلاف کے روایتی و ثقافتی جڑوں سے جوڑتی ہیں۔

لوک دانش کا تعلق کسی خاص مذہب یا مکتبہ فکر سے نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا تعلق ہمارے اجتماعی لاشعور اور مشترکہ تہذیبی اثاثہ سے ہوتا ہے۔ اس پر کسی مذہب کی اجارہ داری نہیں ہوتی۔ یہ ہماری سماجی وراثت ہے اس سے مراد محض عیدین، محرم کے جلوس ہی نہیں بلکہ اس میں ہولی اور دیوالی سبھی کچھ شامل ہیں۔ جس طرح رام، لکھن اور ہنومان ہمارے اجتماعی لاشعور کا حصہ ہیں۔

اسی طرح علی ابن ابی طالب، حسن اور حسین بھی ہمارے حافظے میں تازہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رامائن اور کر بلا دونوں ہی استیہ اور ہنسا پرستیہ اور اہنسا کی فتح کے علامیہ کے طور پر ہمارے یقین و عقیدہ کا حصہ ہیں۔ جس کے سبب راون کو آتش غضب سے جلا یا جاتا ہے اور بڑید پرتہرا پڑھا جاتا ہے۔ اسی طرح سے چید، کبت اور برہا یہ تمام ہمارے بھوج پوری لوک دانش کا ورثہ ہیں۔ انھیں سنجوہ کر رکھنا ہمارا ذمہ داری ہے۔

ایسے وقت میں جب دنیا کی علاقائی اور لسانی شناختیں ختم ہو رہی ہیں۔ ہمارا ملک ہندستان زبانوں کا قبرستان بنا ہوا ہے وہیں بھوج پوری زبان اپنے سنسکرت، سنسکرتی اور سنگیت سے اپنے چاہنے والوں کا من موہ رہی ہے۔

□□□

◆ نیادور دسمبر ۲۰۱۷ء (۵۲)

ہندستانی رنگارنگی اور تنوع لئے موجود ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ انھیں اپنے گاؤں کی مٹی سے محبت ہی نہیں بلکہ عقیدت ہے، زمین کا یہ ازلی رشتہ ان کے برہوں کی جان ہے۔ کچھ مصرعے ملاحظہ کریں۔

یہ بات میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ صفدر خاں کے اس برہے کی قرأت سے قاری پر وہی سرور و سرشاری کی کیفیت طاری ہوتی ہے جو قلی قطب شاہ کی بارہ بیاریاں، میر حسن کی مثنوی سحر البیان اور پنڈت دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم کی مثنویوں کو پڑھنے سے ہوتی ہے، کیونکہ ان کے موضوعات ایک ہیں اور آتش عشق کی آگ میں سبھی یکساں جل رہے ہیں۔ فرق صرف لفظیات، استعارات، تشبیہات اور عربی فارسی ترکیبات کا ہے، یہی تفریق موخر الذکر شعراء کو آفاقی و لافانی بناتی ہے، صفدر خاں کی جو لفظیات اور تشبیہات ہیں، وہ ایک خاص دیہی خطے سے تعلق رکھتی ہیں، ان کی شاعری کا سیدھا رشتہ زمین سے ہے اس لئے ان کے تصورات اور تخیلات کا محور بھی وہاں کی رسمیات ہیں ان کے ذہن و گمان میں یہ بات نہیں آسکتی کہ ہونٹ اپنی نازکی میں گلاب کی پکھڑی کی طرح ہو سکتے ہیں اور لب کی صفت لعل و بدخشانی سے بھی دی جاسکتی ہے، ان کے معشوق کا لب تو سرخ چیختے ہوئے پان کی لالی کی محض پر چھائیں لئے ہوئے ہے۔ اور جب خطاب کرتا ہے تو کوئی عجب لطف نہیں دیتا اور نا ہی اس کے منہ سے پھول جھڑتا ہے بلکہ جب وہ ان سے باتیں کرتا ہے تو منی لگے دانت جھلک اٹھتے ہیں۔ ان کی چنچل نار بڑی شوخ و اٹھو ہے۔

پکھرا ہے گجران شاہ کا پانی رہتا پھچھووانا پنیاسوت بنا ہے جب سے آج تلک نا جھورانا ستووا کھائے پنے کوئی پانی، کو دے جسے ہونہانا

سے بھی دی جاسکتی ہے، ان کے معشوق کا لب تو سرخ چیختے ہوئے پان کی لالی کی محض پر چھائیں لئے ہوئے ہے۔ اور جب خطاب کرتا ہے تو کوئی عجب لطف نہیں دیتا اور نا ہی اس کے منہ سے پھول جھڑتا ہے بلکہ جب وہ ان سے باتیں کرتا ہے تو منی لگے دانت جھلک اٹھتے ہیں۔ ان کی چنچل نار بڑی شوخ و اٹھو ہے، یہی وجہ ہے کہ خیال یار کی ادا و ناز انھیں غافل نہیں ہونے دیتا، ایک چیز جو صفدر خاں کے برہوں اور اردو شاعری کی کلاسیکل روایت میں قدر مشترک ہے وہ محبوب کا ظالم و مغرور ہونا ہے۔ یہاں بھی عاشق صادق آہ و زاری اور نالہ و فغاں کرتا نظر آتا ہے، اور صنم کو منانے کے جو بھی طریقے ہیں ان سب کو آزما تا ہے۔ لیکن وہ کافر صنم ہے کی راضی ہی نہیں ہوتا۔

صفدر خاں کے برہوں کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا محبوب گوشت پوست کا حقیقی انسان ہے۔ جس کیلئے انھوں نے گجھلک تشبیہات اور دورازکار استعارات استعمال نہیں کیے، اور نا ہی محبوب کے سراپا اور چہرے کی تشبیہ سرور عننا اور روشن جبین سے دی۔ ان کے برہوں میں معصوم دیہاتی پن ہے جو ایک خاص قسم کی موسیقیت لئے ہوئے ہے، جس کا لحن ساعت پر گراں نہیں گذرتا۔ اور نہ ہی ذوق کو بوجھل کرتا ہے۔ بلکہ اس دیہی سر میں ایک مخصوص قسم کا سنگیت ہے جو اپنے سنسکارتوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کی تخلیقات کی قرأت میں کہیں کچی نہیں ہے وہ تصنع سے پاک عجمی بھولا پن لئے ہوئے ہے۔

صفدر خاں کے برہوں میں محض واردات قلبیہ اور غم جاناں کا بیان نہیں ہے، بلکہ ان کے اس مخصوص خطے کی روزمرہ کے معمولات اور معاملات کا بھی ذکر ملتا ہے، جس میں گاؤں کی سماجی و معاشرتی زندگی، وہاں کی تہذیب و ثقافت، ہندو مسلم اتحاد و اتفاق سبھی کچھ



ڈاکٹر طاہرہ پروین

شعبہ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

موبائل: 9554711865

اردو ہندی زبانوں کا سنگم اور ہندوستانی تہذیب

تقریباً سب سے بڑے شاعر علامہ اقبال نے تو قریب
- قریب اپنی شاعری کی شروعات ہی اپنی نظم ”سارے
جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا“، ہندوستانی بچوں کا
قومی گیت اور ”ہمالیہ“ جیسی نظموں سے کیا۔

یہ اردو ہندی زبان اور ہندوستانی تہذیب و

تمدن کی بہترین مثال ہے۔ یہاں تک کہ بچوں کے

لئے گائے، بکری، ماں کی دعا، مکڑا اور مکھی جیسی نظمیں

لکھ کر ہندوستان میں ایک ہر دل عزیز کی فضا پیدا

کی۔ یہاں تک کہ انہوں نے ”ہمالیہ“ جیسے پر بت کو بھی

اپنی فکر کا موضوع بنایا اور اسلامیات سے متاثر ہونے

کے باوجود بھی ”گاندھی منتر کا ترجمہ“ کیا اور ”رام“

جیسی عظیم شخصیت پر نظمیں لکھیں۔ اپنی اسی موڈ کی

نظموں میں (ماں کی دعا) (ایک مکڑا اور مکھی)

(بکری) (گائے) نظموں کے ذریعے زمانے کے

بدلتے رنگ کے نقوش کو بھی ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

اقبال جہاں ہندوستانی تہذیب اور فضا کی

تعریف کرتے ہیں وہیں وہ یہاں کی مفلسی، غرتی، بے

چارگی، کسمپرسی سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔ اقبال نے

اپنی مذہبی روح میں صرف مسلمانوں کو ہی نہیں رکھا بلکہ

ہندوستانی تہذیب بھی انکی فکر و فلسفے کا مرکز و محور رہا ہے۔

اس طرح اگر یہ کہا جائے کہ اقبال ایک مشترکہ

تہذیب کے علمبردار تھے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ بات وضاحت

کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب

کے کس حد تک وہ حامی تھے۔ اقبال کے ساتھ ہی سرور

جہاں آبادی کی شاعری میں بھی اردو ہندی زبان اور

ایک خاص اثر چھوڑا ہے۔ پھر شاعروں اور ادیبوں سبھی

نے متاثر ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے جہاں ایک طرف

سیاسی حالات کی اپنی لہر تیز کی وہیں شاعر و ادیب بھی

اس جنگ آزادی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے اور

اپنے خیالات کا اظہار انہوں نے خالص ہندوستانی رنگ

یہ اردو ہندی زبان اور ہندوستانی

تہذیب و تمدن کی بہترین مثال ہے۔ یہاں تک

کہ بچوں کے لئے گائے، بکری، ماں کی دعا، مکڑا

اور مکھی جیسی نظمیں لکھ کر ہندوستان میں ایک ہر

دل عزیز کی فضا پیدا کی۔ یہاں تک کہ انہوں

نے ”ہمالیہ“ جیسے پر بت کو بھی اپنی فکر کا موضوع

بنایا اور اسلامیات سے متاثر ہونے کے باوجود

بھی ”گاندھی منتر کا ترجمہ“ کیا اور ”رام“ جیسی

عظیم شخصیت پر نظمیں لکھیں۔ اپنی اسی موڈ کی

نظموں میں (ماں کی دعا) (ایک مکڑا اور مکھی)

(بکری) (گائے) نظموں کے ذریعے زمانے

کے بدلتے رنگ کے نقوش کو بھی ابھارنے کی

کوشش کی ہے۔

میں کیا ساتھ ہی ساتھ اپنی شاعری کے ذریعے ہندوستانی

فضا میں رچ بس کر شاعری کو اسی میں سمویا اور یہ بتانا چاہا

کہ ہندوستان میں اگرچہ مختلف مذاہب کے لوگ رہتے

ہیں لیکن ان میں اختلاف ہونے کے باوجود بھی ایک

میں ایکٹا کے جذبات نمایاں ہیں۔ بیسویں صدی کے

جہاں ہم مذہب کی بات کرتے ہیں وہیں پر ہم

ذات پات اور فرقہ بندی کے خانوں میں کھڑے ہو

جاتے ہیں۔ ہم اور آپ پہچان بنانے کے لئے زبان کو

بھی کئی خانوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ مثلاً اردو

مسلمانوں کی، ہندی ہندوؤں کی پنجابی سکھوں کی اور

بلکہ بنگالیوں کی زبان اور اسی طرح سے دیگر زبانیں بھی

لیکن جب ادب میں ان ہی زبانوں کا ملا جلا سنگم

دیکھتے ہیں تو پھر نہ کوئی اردو اور ہندی کا جھگڑا ہوتا ہے نہ

ہی کوئی فرقہ بندی اور ذات پات کا جھگڑا ہوتا ہے۔ اسی

ادب میں نہ جانے کتنے ادیبوں نے اپنے شعری

مجموعوں کو دوسرے مذہبوں اور زبانوں کے تئیں جس

عقیدت کے ساتھ معنون کیا ہے اور ان کو ایک لڑی میں

پر دیا ہے جس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ ادیب،

شاعر نقاد وغیرہ جتنا اپنے مذہب سے محبت کرتے ہیں

اتنا ہی دوسرے مذہبوں کے تئیں بھی لگاؤ رکھتے ہیں۔

ہندوستان کی مختلف تہذیبوں کو سمجھنے سے پہلے یہ

بھی سمجھنا ضروری ہے کہ یہاں کے مختلف مذاہب کی

صورتیں کیا رہی ہیں؟ اور لوگ کس طرح ان کا اتباع

کرتے رہتے ہیں کہ جس کے رسم و رواج عقیدوں اور

طور طریقوں میں بہت اختلاف پایا جاتا رہا ہے۔ اسی

کے ساتھ ساتھ الگ زبانوں نے بھی ہندوستانی

تہذیب پر خاصہ اثر ڈالا ہے لیکن اختلاف کے باوجود

یہاں کی تہذیبی فضا پروان چڑھی اور سب میں

یکتا نیت کا جذبہ دکھائی دیتا ہے جو خاص کر ہندوستانی

تہذیب کو قائم رکھتا ہے اور جس نے زبان و ادب پر

خالص ہندوستانی رنگ نظر آتا ہے۔ کہتے ہیں پھولوں کا گچ دکش بھارت میں اک بنائیں حُب وطن کے اس میں پودے نئے لگائیں اک ایک گل میں پھونکیں روح شمیم وحدت اک اک کلی کدول کے دامن سے دیں ہوائیں یہاں پر سرور کی ہندوستانی تہذیب کے خدوخال کو بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ انہوں نے ہندوستان میں ہونے والے فسادات اور رنگ و نسل کے نام پر جو جھگڑے تھے ان کو بہ طور پر دور کرنے کی کوشش کی اور اپنی نظموں کے ذریعے ہندوستان کے لئے ایک مشعل راہ کا کام کیا۔ اس طرح ڈرگا سہائے سرور کی پوری شاعری تقریباً ہندوستان کے تہذیبی شعور کی مرہون منت ہے اور اپنے عہد کی پوری تاریخ کے فرائض انجام دیتی ہے۔ سرور کے ساتھ پنڈت برج نرائن چکبست کا نام آتا ہے۔ جن کی پوری شاعری میں عام طور پر یہی رنگ موجود ہے۔ وہ اپنی نظموں میں تقریباً ہر جگہ ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کو پیش کرتے ہیں۔

گوتم نے آبرو دی اس معبد کہن کو سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو اکبر نے جام الفت بخشا اس انجمن کو سینچا لہو سے اپنے رانا نے جس چمن کو سب سور میر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں چکبست ہندوستان اور اس کی تہذیب کو تو ایک سرمایہ افخار سمجھتے ہیں۔ اگرچہ ان کا نظریہ نظر، قومی یکجہتی اور تصور آزادی تھا۔ کچھ یہ بھی ہے کہ اس وقت یہ ہندوستان کی ایک طرح کی مجبوری بھی تھی کہ انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کا یہی واحد راستہ تھا اور یہ بھی کہ اس طرح ہندوستانیوں کو وہ ان کے قدیم تاریخ اور کارنامے یا دولا کر ان کی حمیت کو بیدار کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ تمام رنگ ملیں، ایک نور پیدا ہونے والی صورت ملک میں پیدا ہو سکے۔ لیکن چکبست صرف اس

آزادی کی جنگ تک محدود نہ تھے بلکہ وہ ہندوستان کی یگانگت کی فضا کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ وہ ایک لبرل اور سیکولر آدمی تھے، اور وہ اسی انداز میں ہندوستان کے بارے میں سوچتے تھے کہ اگر ہندوستان میں رہنے والوں کو ظلم سہنے پڑے ہیں تو اس کے پیچھے برطانیہ کی بڑھتی ہوئی طاقت ہی اس کی ذمہ دار ہے۔ اور پھر ہندوستانیوں کی حوصلہ افزائی اپنی نظم ”برطانیہ کی بستی“ میں اس طرح سے کرتے ہیں۔

اگر وہ دولت برطانیہ کے پیارے ہیں تو اہل ہند بھی اس آسمان کے تارے ہیں ایک اور موقع پر ہندو مسلم کو ایک ہونے کے لئے اس طرح جھجھوڑتے ہیں۔

اگر نہ قوم کے اس وقت بھی تم آئے کام نصیب ہوگا نہ مرنے پہ بھی تمہیں آرام چکبست کے ساتھ ہی اکبر الہ آبادی کا نام بھی یہاں نہیں بھولنا چاہئے۔ اکبر جہاں سیاسی شعور کو سنجیدگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں وہیں پر ہندوستانی تہذیب کو بھی اپنی شاعری کا مرکز قرار دیتے ہیں اور خالص ہندوستانی رنگ اختیار کر کے طنزیہ لہجے میں اپنی بات بھی کہنے سے گریز نہیں کرتے۔

زیادہ بڑھ جاتے تھے، اکبر نے اس پر طنزیہ باتیں کر کے ہندوستانیوں کو غیرت دلانے کی کوشش کی ہے۔

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی اب وہ شمع بزم ہے پہلے چراغ خانہ تھی

ایک دوسرے شاعر تلوک چندر محروم بھی ہندوستانی تہذیب اور تحریک آزادی کے پُر جوش لیڈر تھے۔ ان کی ایک نظم ”ہندی نوجوانوں سے“ ملتی ہے۔ ان کی شاعری کا فکری محور بھی ہندوستان ہے۔ کہتے ہیں:

تو مسلم ہے کہ ہندو ہے غرض اس سے نہیں مجھ کو محبت ہے وطن سے تجھ کو اتنا ہے یقیں مجھ کو یہی رنگ جوش ملیح آبادی میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جوتس کے یہاں انقلابیت اور گھن گرج کچھ زیادہ ہے اور اقبال کے یہاں فلسفہ اور تہذیبی صورتیں زیادہ نمایاں ہوتی ہیں۔ جوتس کی نظم ”کسان“ خالص ہندوستانی مزاج کی نظم ہے اپنی نظم کسان میں اردو ہندی زبانوں اور ہندوستانی تہذیب و تمدن کی عکاسی کسان کے ذریعے سے کرتے ہیں اور پسماندہ طبقے کے ذریعے جاگیر دارانہ نظام کی طرف ایک چیلنج بھی کرتے ہیں کہ اگر کسان نہ ہو تو یہ ساری شان و شوکت، اور زناکتیں اور نفاستیں دھری کہ دھری رہ جائیں گی۔ اپنی نظم ”مستقبل“ میں کہتے ہیں۔ اس میں جوتس مہاجن، سیتھ، ساہوکار، زردار، جاگیر دار، سرمایہ دار، حاکم ان سب کو اپنی شاعری کے ذریعے سے اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ ساری باتیں معلوم ہو جائیں جو ہندوستان کی بد حالی کی ذمہ دار ہیں۔ آخر میں یہ بات کہی جائے تو غلط نہ ہوگی کہ اردو ہندی زبان کا یہ ملا جلا سنگم اور ہندوستانی تہذیب کی جمالیات کو پیش کر کے اپنا ایک خاص رنگ پیدا کیا اور ہندوستانی تہذیب کی ایک خاص تاریخ بنائی جو گیسو اور لب و رخسار سے ہٹ کر خالص ہندوستانی تہذیب کی عکاسی کرتی ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

□□□



دیکھو بد کی

A-102، سیکٹر B-4، وسندھرا، غازی آباد
موبائل: 9868271199

پھٹا ہوا البسم

”پتا جی، آپ بھی ناں... کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔“

سویشیلا نے اجازت ملتے ہی الماری کی چیزیں نکال نکال کر فرش پر پھینکنا شروع کر دیں۔ میں اپنے بیڈ پر آلتی پالتی مار کر خاموشی سے نظارہ دیکھتا رہا۔ میری زندگی کا کل اثنا شبہی کتابیں تھیں جو فرش پر بکھیری جا رہی تھیں۔ پوری الماری اردو کتابوں سے ٹھسٹھس بھری پڑی تھی جن کو میں نے عمر بھر جان سے بھی زیادہ عزیز رکھا تھا۔ کوئی پڑھنے کے لیے مانگتا تو صاف انکار کر دیتا۔ میرے لیے تو یہ خزانے سے کچھ کم نہ تھیں۔“

سویشیلا الماری سے لگا تار کتابوں کو برآمد کر کے فرش پر پھینکتی چلی جا رہی تھی۔ ان سے لپٹی ہوئی برسوں کی دھول الگ ہو کر اڑ رہی تھی اور کمرے میں غبار کے مرغولے بن رہے تھے۔ اس نے اپنی ناک پر پہلے ہی سے ماسک لگا رکھا تھا۔ مجھ پر جو نظر پڑی تو کہنے لگی۔

”پتا جی، کمرے میں بہت ساری دھول اڑ رہی ہے، بہتر یہ ہے کہ آپ باہر ڈرائنگ روم میں بیٹھ جائیں۔“

”نہیں بہو تم اپنا کام کرتے رہو، میری چٹنا مت کرو۔“ میں نے صاف منع کر دیا۔ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھ سے پہلے میری ملکیت کا جنازہ اٹھ رہا ہے۔ اس لیے میں اس کے آخری درشن کرنا چاہتا تھا۔ پھر بھی میں نے احتیاطاً اپنی ناک کو کپڑے سے ڈھانپ لیا۔

الماری سے ایک ایک کتاب نکلتی رہی اور فرش پر بکھرتی رہی اور اس طرح میرا ماضی میری آنکھوں

”ہاں بہو، سوتو ہے۔ اب اس الماری کو کھول کر مجھے کرنا بھی کیا ہے؟ اس میں ایسا کچھ بھی تو نہیں جو میرے کام آسکے۔“ میں نے اپنی لاتعلقی کا اظہار کیا۔

”پتا جی کیا کریں۔۔۔ ان بڑے شہروں میں متوسط گھرانوں کی یہی توجہ و بوجہاں ہیں۔ دو کمروں کے اس فلیٹ میں بہت تنگی محسوس ہوتی ہے۔ ایک کمرہ ہم نے گھیر لیا ہے، دوسرا کمرہ آپ کے پاس ہے اور باقی رہا ڈرائنگ کم ڈائمنگ روم، اس میں اٹھو بیٹھو، کھاؤ پیو اور مہمانوں کی میزبانی کرو۔ گزشتہ برس عقبی بالکونی میں ناچائز تیار بھی کر لیا تھا مگر پھر بھی بات نہیں بنی۔ دونوں بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ ان کو سونے کے لیے الگ کمرے اور کتابیں رکھنے کے لیے الگ الماریاں چاہئیں۔ روی تو خیر آپ کے کمرے میں سوتا ہے اور شارکا تو سوچ شدہ بالکونی میں۔ مگر دونوں کو الماری کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔“

”ہاں انکی مانگ مناسب ہے۔ الماری کو خالی کر دو۔ اس میں جو کچھ رکھا ہے اس کو ردی میں بیچ دو یا پھر جلا دو۔ میرے کس کام کا؟ میں اپنے کاندھوں پر لے جانے سے رہا۔ پچھتر پار کر چکا ہوں اب تو لا د چلنے کا وقت آ گیا ہے، کہاں تک ان چیزوں کو ڈھوتا پھروں۔“

”نہیں پتا جی، ایسا نہ کیسے، بھگوان آپ کو لمبی عمر دے، آپ کا سایہ تو ہمارے لیے نعمت ہے۔“

”ایسا نہ کہو بہو۔ آج کی دنیا میں کسی کے لیے لمبی عمر کی دعائیں مانگنا بد دعا دینے کے برابر ہے۔ صرف یہ کہو کہ جب تک ہاتھ پاؤں چلیں تب تک بھگوان زندہ رکھے۔“

”دادو، یہ البم دیکھ لوں کیا؟“ میری پوتی مجھ سے مخاطب ہوئی۔

”ہاں ہاں، دیکھ لو، ضرور دیکھ لو۔ تمہیں کس نے روک لیا؟“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اس کے ہاتھ میں جو البم تھا اس میں میرا ماضی قید تھا۔ یادوں کی ایک بھر پور کتاب! زندگی کا لیکھا جو کھا! کچھ حسین پل اور کچھ دردناک لمحے! ان تصویروں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ یہ تصویریں اور ان سے جڑی یادیں میری اپنی تھیں، باقی سب کچھ وقت کے ساتھ تبدیل ہو چکا تھا۔

شارکا البم کو جھاڑنے لگی۔ اس جھاڑنے جھٹکنے کی کارروائی میں البم کی جلد جدا ہو کر فرش پر گر گئی۔ شارکا نے اسے فرش سے اٹھا کر واپس البم کے ساتھ عارضی طور پر جوڑ دیا اور پھر البم کی ورق گردانی شروع کرنے لگی۔ دفعتاً اسے کچھ یاد آیا، اس لیے جلدی سے البم بند کر کے دوبارہ اپنے کام میں جٹ گئی۔ وریں اثنا اس کے معصوم چہرے کے اُتار چڑھاؤ دیکھتا رہا اور اپنے ماضی کے دھندلوں میں کھو گیا۔

یادیں... بیٹھی یادیں... تلخ یادیں... سکون بخش یادیں... اذیت رساں یادیں! دراصل کچھ دنوں سے میری بہوشیلا کو الماری کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ ڈرتے ڈرتے اس نے مجھ سے درخواست کی۔

”پتا جی، جب سے ہم اس فلیٹ میں آئے ہیں، آپ کی یہ الماری کبھی کھلی ہی نہیں۔ پہلے روز آپ نے اس میں اپنا سامان بھر دیا اور بس...“

کے سامنے پراگندہ ہوتا رہا۔

اسی دوران میں الماری سے تصویروں کا ایک چھٹا پرانا البم برآمد ہوا جو میری پوتی نے بڑے انہماک سے اپنے ہاتھ میں اٹھالیا۔ ”دادو۔۔۔ اس البم کو تو نہ پھینکنے۔ اس میں آپ کے بچپن اور جوانی کی یادیں محفوظ ہیں۔“

ایک سو بیسہ پھٹا ہوا البم تھا جو شاکر نے میرے سامنے میز پر رکھ دیا۔ اس کے بعد نہ جانے اسے کیا خیال آیا کہ اسے دیکھنے کے لیے محل اٹھی اور مجھ سے اجازت مانگی۔ کچھ ورق الٹ کر اسے یاد آیا کہ پہلے ماں کا ہاتھ بٹانا چاہیے، اس لیے چپکے سے البم میز پر رکھ دیا اور الماری خالی کرنے میں منہمک ہو گئی۔

”پتاجی ان کتابوں کی نکاسی کے بارے میں کیا سوچا ہے آپ نے؟“ سشیلہ نے سوال کیا۔

سوال معقول تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ زندگی کے اس سرمائے کا کیا کروں جو میں نے عمر بھر جمع کیا تھا۔ اب تو کسی کام کا نہیں ہے۔ گھر میں کسی کو اردو آتی نہیں، لکھنا تو لٹچا، پڑھنا بھی نہیں آتا۔ پھر الماری میں سجا کر کس لیے رکھوں؟ کوئی ایسا ادارہ بھی تو نہیں جو ان کتابوں کو اٹھا کر لے جائے اور اپنی لائبریری میں رکھ لے۔ مجھے وہ دن یاد آئے جب میں بروڈہ کی پبلک لائبریری کا ممبر تھا۔

اردو کتابیں کیا نکال لیتا تھا کہ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی تھیں۔ کوئی کتاب گذشتہ صدی کی چھٹی دہائی میں آخری بار ایٹھ ہو چکی تھی اور کوئی ساتویں دہائی میں۔ ایسی کوئی بھی کتاب نظر سے نہیں گزرتی تھی جس پر پچھلے دو چار برسوں کی مہر لگی ہو۔ سالہا سال سے ریکوں میں پڑی ہوئی وہ کتابیں اپنے اوپر گرد و غبار اوڑھ رہی تھیں۔ کوئی صاف کرنے والا بھی نہ تھا۔ ایک سرکاری خا کروب تھا جو ہر سری طور پر فرش صاف کر کے چلا جاتا۔ اس پر مصیبت یہ کہ کتابوں پر ہر سال کرم کش دوائی چھڑکی جاتی تھی جس کی سفید تیشوں ایک کے اوپر ایک جمع ہو رہی تھیں۔ مجھے ان کتابوں کا مطالعہ کرتے سے کوفت ہوتی تھی۔ ان کو صاف کرنے اور دھوپ دکھانے میں خاصا وقت نکل جاتا تھا

تب جا کر ان کا مطالعہ ممکن ہوتا تھا۔ بعد میں مجھے کرم کش دوائی سے الرجی ہونے لگی اور مطالعے سے پرہیز کرنا پڑا۔ ”آپ نے جواب نہیں دیا۔“ سوشیلا پھر گویا ہوئی۔ ”مجھ سے کیا پوچھتی ہو بہو، جو من میں آئے کرو۔“ مجھے دفعۃً یاد آیا کہ اس ذخیرے میں میرے نانا جی کی دی ہوئی چند کتابیں تھیں جو انھوں نے مجھے تحفے میں دی تھیں۔ وہ اردو اور فارسی کے بہت بڑے عالم تھے۔ کشمیری پنڈت اور کاسٹھ اردو کے مخلص خدمت گزار رہے ہیں مگر اب ان کتابوں کی طرح انھیں بھی کوئی پوچھنے والا نہیں۔ وہ زمانہ ہی کچھ اور تھا۔ اردو زبان مشترکہ تہذیب کا آئینہ تھی۔ ان دنوں زبانوں سے نہ ناطوس کی صدا سنائی دیتی تھی اور نہ اذان کی گونج۔ میرے نانا جی نے جب یہ سنا کہ میں نے اردو زبان سیکھ لی ہے اور اب اس میں لکھتا بھی ہوں تو حیران ہوئے۔ اٹھ کر اپنی الماری سے چند کتابیں نکالیں اور مجھے سوئپ دیں۔ ”بہار الال، یہ چند اردو کتابیں میری طرف سے تمہیں بطور تحفہ! دیکھو چاروں ویڈیوں کے ترجمے ہیں، رامائن اور مہابھارت کے ترجمے بھی ہیں اور پھر جھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ ہے۔ دل کی گیتا“ تو اپنے زمانے میں بہت مقبول ہو چکی تھی۔“

میں نے کتابیں لے کر آنکھوں سے لگائیں اور پھر اپنی الماری میں سجائیں۔ ان سے میری فردا کی امیدیں وابستہ ہو گئیں۔ ناستک ہونے کے باوجود میں نے ان کا مطالعہ کیا کیونکہ علم حاصل کرنے میں مجھے کبھی کوئی قباحت محسوس نہ ہوئی۔ وہ چاہے مذہبی صحیفے ہوں یا جنسیات سے متعلق کتابیں۔ سوشیلا نے موبائیل پر ردی والے کو بلا یا۔ اس اثنا میں ماں بیٹی دونوں نے ساری کتابیں اٹھا کر صدر دروازے کے پاس چٹا لگا کر رکھ دیں۔ کچھ دیر بعد سارا اثاثہ کوڑیوں کے دام بک گیا اور میں دیکھتا رہ گیا۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی مگر لبوں پر مسکراہٹ چھپ رکھی تھی تاکہ دروں کی کیفیت چہرے پر ظاہر نہ ہو۔ البتہ کمرے سے باہر نکل کر ردی والے کو کچھ سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ ”بھائی بہت

تبعیتی کتابیں ہیں، میری مانتو انھیں کتاب بازار میں بیچ ڈالو۔ اچھے دام مل جائیں گے۔“

”بابو جی، یہ کوئی جہان لکھا ہے اس میں، ہمار تو سمجھ میں نہیں آتا۔“

”ارے بیوقوف، اس کو اردو زبان کہتے ہیں۔“

”ہاؤ بابو جی، تو ای ہے اردو جہان، سن رکھا ہے بجرگوں سے۔ پرتو اس کا یہاں کوئی خریدار نہیں ہے صاحب۔“ میں خاموش ہو گیا، کچھ جواب نہیں دے پایا۔ چپ چاپ اپنے کمرے میں واپس چلا آیا۔ پیچھے سے بہو کی آواز سنائی دی۔ ”پتاجی ویسے بھی جب سے یہ کمپوٹر آیا ہے، کتابوں کو کون پوچھتا ہے۔ اب تو سب کچھ انٹرنیٹ پر ملتا ہے۔“

اس کے بعد ماں بیٹی فارغ ہو کر اور نہا دھو کر اپنے اپنے کام میں لگ گئیں اور ادھر میں بھی غسل کر کے اپنے بیڈ پر چارز انو بیٹھ گیا۔

الماری خالی ہو گئی تھی۔۔۔ کتابیں بک چکی تھیں۔۔۔ باقی چیزیں کوڑے دان کے حوالے کر دی گئی تھیں۔ شہار کا موقع پاتے ہی میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی اور البم دیکھنے لگ گئی۔

مانگ کی طرح بہتا ہوا لدر در یا جس کو کولوبائی گلشیر حیات بخشا تھا۔ کبھی گھڑ سواری اور کبھی ٹراوٹ مچھلی کا شکار۔ پھر دونوں کے بیچ عہد و پیمان ہوئے۔ خط و کتابت ہوتی رہی۔ لمبے لمبے خط۔۔۔ ایک خط میں تو اس نے ریکارڈ ہی توڑ دیا۔۔۔ ایک سو صفحات کا خط۔۔۔ اور اس کے ساتھ اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی چند تصویریں۔۔۔ رادھا کرشن کی۔۔۔ مختلف پوزز میں۔۔۔ بہت اچھی مصورتھی۔ اس کے بعد وہ ہر سال کشمیر آتی رہی، ہم دونوں ایک دوسرے سے ملتے رہے اور اپنی محبت کا احیا کرتے رہے۔ کشمیر میں ایسا کوئی اہم مقام نہیں ہے جہاں ہم نہیں گئے اور تصویریں نہیں اتروائیں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ اپنے والدین کو منالے گی کیونکہ اس کی طبیعت میں شورہ پشتی تھی مگر وہ بھی عام لڑکیوں جیسی نکلی۔ ممبئی میں ایک آرکیٹیکٹ سے شادی کر لی کیونکہ اس کا باپ ایک نامور آرکیٹیکچرل فرم کا مالک تھا۔

اس واقعے کے بعد میں نے اپنے ماتھے پر 'ٹولٹ' کا بورڈ پھر چڑھایا۔ لڑکیاں دکھتیں، مسکرا دیتیں اور چلی جاتیں۔ انہیں شاید احساس ہو گیا تھا کہ ایک بے روزگار کے ساتھ مغز ماری کرنا کوئی عقل کی بات نہیں ہے۔ دو تین برس جب یوں ہی گزر گئے تو میں نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تب تک میں صاحب روزگار بھی ہو چکا تھا۔ اب کوئی وقت نہیں تھی۔ اس بار تو خالی فلیٹ میں کرائے دار نہیں بلکہ مالکن درکار تھی۔ میں تو جہیز کے خلاف تھا۔ میرا اصول پر بیم چارج کرنے یا بلیک میں روپیہ وصول کرنے کے خلاف تھا۔ اس لیے اس نے قابض ہونے میں دیر نہیں کی۔

بہر حال کبھی کبھار روایتوں سے بغاوت کرنے کا غیر متوقع انجام نکلتا ہے۔ مال مفت دل بے رحم۔ مکان کم قیمت پر مل جائے تو پائیداری پر سوال اٹھتے ہیں۔ دل میں وسوسے پیدا ہوتے ہیں۔ آخر مال اتنا سستا کیوں ملا؟ ضرور اس میں کوئی ملاوٹ ہوگی۔ شاید

برہمن تھے مگر برہمن سہن، طور طریق اور زبان الگ تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ جب اس کے والدین نے سنا کہ میں میٹ مچھلی کھانے والا برہمن ہوں تو بگڑ گئے۔ اس کے بعد کچھ بھی سننے کو تیار نہ ہوئے۔“

کچھ مزید اوراق الٹ کر شاکا کو ایک اور صورت نظر آئی اور وہ پھر اسی تجسس سے پوچھنے لگی۔“ اور دادو، یہ کون ہے؟ لگتا ہے لائن میں دوسرے نمبر پر لگی ہوگی۔“

”یہ بھی فرینڈ تھی میری۔ کرشمہ اگر وال! شکل و



صورت سے اتنی خوبصورت نہیں تھی جتنی ونودنی مگر دولت مند تھی۔ خود ممبئی میں آرکیٹیکچر کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ والد صنعت کار تھے۔ لاکھوں کا بزنس تھا۔ ان دنوں لکھ پتی ہونا فخر کی بات تھی۔ اب تو کروڑوں سے کم کوئی بات ہی نہیں کرتا۔ ہماری ملاقات پہلا گام میں ہوئی تھی جہاں وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ سیر سپاٹے کے لیے آئی تھی۔ برف سے لدے پہاڑوں کے درمیان، سرسبز مرغزاروں میں، بچوں بیچ والہن کی

مارے اپنے پیار کو زبان نہیں دے پاتی تھیں۔ ان دنوں لڑکی محبوب کو دیکھ کر آنکھوں کے کواڑ بند کرتی اور دل میں اس کی تصویر بسا لیتی، کچھ عرصے تک اس کی آراہنا کرتی، پھر کوئی آنجان اور ان دیکھا مسافر گھر کے دروازے پر کھڑا ہوتا اور دل کے مندر کی صورت بدل جاتی۔

”بیٹی، ان دنوں وسائل اتنے محدود تھے کہ اپنے شہر سے آگے کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ ایک آل انڈیا ریڈیو تھا جو کچھ کہتا اس پر یقین کرتے۔ میں پہلی بار پوسٹ گر بیجوشن کے دوران پیر پنجال پارکس کا۔ مجھے یاد ہے کہ جانے سے پہلے والد نے مجھے اپنی اور مال و اسباب کی حفاظت کے بارے میں گھنٹے بھر لیکچر دیا تھا۔“

شاکا ورق الٹی رہی۔ جانی پہچانی صورتوں کو وہ نظر انداز کرتی چلی گئی مگر اچانک اس کی نظر ایک خوبصورت لڑکی پر پڑی۔ گلمرگ کی حسین وادیوں میں وہ اور میں بانہوں میں بانہیں ڈالے ایک دوسرے پر برف کے گولے چسبک رہے تھے۔ شاکا اچھل پڑی۔ ”ہاؤ سویت، اتخیل جیسی لگ رہی ہے۔ دادو کون ہے یہ؟ میں نے تو کبھی نہیں دیکھا اس کو۔“

”یوں ہی ایک دوست تھی جس کے ساتھ یہ تصویر کھنچوائی تھی۔ پونیوٹی میں میرے ساتھ پڑھتی تھی۔ گلمرگ ایکسپریشن پر گئے تھے۔“ میں نے جواب دیا۔

”د.....د.....دووو! کچھ تو گڑ بڑ ہے۔ جسٹ کانسٹیبل اے کلاس فیلو اونٹلی! وہ پھر شرارت پر اتر آئی۔“ شاکا.... اور کوئی کام نہیں ہے تمہیں۔ کیوں

دادو کو تنگ کر رہی ہو؟“ ماں نے کچن سے ہانک ماری۔ شاکا کے اشتیاق کو دیکھ کر آخر مجھے سچ بولنا ہی پڑا۔ ”وہ تصویر میری پہلی محبت کی ہے جس سے میں دل و جان سے پیار کرتا تھا۔ بس یہی مذہب، ذات اور نسل انسانوں کو اپنا بنانے سے روکتے ہیں۔ ونودنی کلکرنی نام تھا اس کا۔۔۔ پونے کی مراٹھی برہمن تھی۔ اس کے والد کی پوسٹنگ مقامی پنجاب نیشنل بینک میں ہو چکی تھی۔ یونیورسٹی میں میرے ساتھ پڑھتی تھی۔ گودونوں

بیچنے والے نے خریدار کی آنکھوں میں دھول جھونکی ہوگی۔ اور پھر جس سوڈے میں اندیشے رہتے ہیں اس میں پائیداری کہاں؟ ایک نہ ایک دن تو رشتوں میں دراڑ آتی جاتی ہے۔“

الہم کے اگلے صفحات میری گھریلو زندگی کی تصویروں سے بھرے پڑے تھے۔ شادی کے منڈپ پر کھینچی ہوئی تصویریں، تفریحی مقامات پر لی گئی تصویریں، رشتے داروں کے ساتھ اتاری گئی تصویریں....! میری پوتی الہم میں ایک تصویر کو فور سے دیکھ رہی تھی جس کا عکس کچھ کچھ اسے اپنے باپ کی صورت میں نظر آ رہا تھا۔ یہ تصویر ان صفحوں پر ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ اس نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”یہ دادی کی تصویر لگ رہی ہے؟ ایم آئی رائٹ؟“

”یس یو آر رائٹ۔ یہ تمہاری دادی ہے جو تمہارے جنم سے پہلے ہی گھر چھوڑ کر چلی گئی۔“

بچن سے پھر آواز آئی۔ ”شمارکا، تم چپ کر کے نہیں بیٹھ سکتی کیا؟“ سوٹیل کے لہجے میں عجیب سی کڑواہٹ عود کر آئی تھی جیسے کسی نے اس کے زخم کر دیے ہوں۔

شمارکا تب بھی نہیں سمجھی۔ وہ تو معصومیت کا پیکر تھی پھر کیونکر اسے احساس ہوتا کہ گھر میں دادی کے بارے میں سوال کرنے کی ممانعت ہے۔ اس نے گھر میں کبھی کسی کے منہ سے دادی کے بارے میں کوئی بات نہیں سنی تھی۔ رنجیدہ ہو کر اس نے الہم میز پر رکھ دیا اور اٹھنے لگی مگر میں نے روک لیا۔

”بیٹی، یہ تمہاری دادی اور تمہارے پتاجی کی ماں ہے۔ ہم دونوں نے باضابطہ شادی کی تھی مگر وہ اس شادی سے خوش نہیں تھی۔ کبھی تھی کہ اس سے بہتر تھا کہ میری شادی کسی رکنے والے سے ہو جاتی، یوں میرا دم نہ گھٹتا۔ وہ شاید اپنے شوہر کے روپ میں ایسے آدمی کو دیکھنا چاہتی تھی جو اس کا اطاعت گزار ہوتا۔ دن بھر

مزدوری کر کے رات کو تازگی پی کر جھومتا ہوا آجاتا اور دن بھر کی کمائی اس کی جھولی میں ڈال دیتا۔ اس طرح گھر میں اس کی حکمرانی ہوتی۔“

”پھر اس نے آپ سے شادی کیوں کی؟ رکنے والے سے شادی کر لیتی۔“ شمارکا نے ایک اور سوال داغا۔

”ہمارے دیس میں لڑکیوں کی کہاں چلتی ہے۔ ماں باپ جہاں شادی کرتے ہیں وہاں کرنی پڑتی ہے۔“

”ایسی صورت میں تو شادی کر کے ایڈ جسٹ کرنا چاہیے تھا۔ سب کی زندگی دوزخ بنا دی۔ میری اتنی سہیلیاں ہیں۔ ان کے ماں باپ بھی لڑتے جھگڑتے ہیں مگر زندگی کی کشتی کو منجھدار میں تو نہیں ڈبو تے۔“

”بیٹی، تالی دونوں ہاتھوں سے بجاتی ہے۔ ایڈ جسٹ منٹ کے لیے دونوں کو کوشش کرنی پڑتی ہے۔ اگر ایک فریق یہ سمجھ لے کہ ایڈ جسٹ کرنا دوسرے کا فرض ہے تو اس حالت میں گھر سنورنے کے بجائے بکھر جاتا ہے۔“

”تو کیا آپ لوگوں نے کبھی ایڈ جسٹ نہیں کیا؟“

”بہت بار کوشش کی مگر شعوری طور پر نہیں۔ دراصل ہم ایڈ جسٹ منٹ کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ وہ اپنی دنیا میں گم ہونا چاہتی تھی اور میں اپنی دنیا میں۔ ہم دونوں باہمی مسابقت کے سبب ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہے۔ اسی تنگ و تاز میں دونوں ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔“

”اوہ میں سمجھی۔ دادو، اب وہ کہاں ہے؟“

”اس نے میرا گھر چھوڑ کر اپنا الگ گھر بسا لیا ہے۔ تمہارے والد کے علاوہ ہماری ایک اور بیٹی بھی ہے جو اس کے ساتھ رہتی ہے۔ اس نے شادی نہیں کی۔ والدین کی زندگی سے تنگ آ کر اس نے کنواری رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ دونوں آسٹریلیا میں رہتی ہیں۔“

”آپ کب سے اکیلے ہیں؟“

”یہی کوئی دس برس ہوئے۔ ویسے بھی وہ کب

گھر میں رہتی تھی۔ کبھی اس بہانے اور کبھی اس بہانے چلی جاتی تھی۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم نے آدھی ازدواجی زندگی اکٹھے اور آدھی جداگانہ کاٹی ہوگی۔“

دریں اثنا سوٹیل دونوں کے لیے ناشتہ بنا کر لائی اور بڑے کرخت لہجے میں شمارکا سے مخاطب ہوئی۔ ”تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ تم ان باتوں کی طرف دھیان مت دو۔ بڑوں کی باتیں ہیں، بڑے نیٹ لیں گے۔ فالٹو میں اپنا وقت کیوں ضائع کر رہی ہو۔ چند دنوں میں ہاف انیورسٹی امتحان شروع ہو جائے گا، جا کر تیاری کیوں نہیں کرتی۔“

شمارکا سنجیدہ ہو گئی۔ جلدی جلدی اپنے ہاتھوں میں ناشتے کا پلیٹ اٹھا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ سوٹیل کا پارا سائٹو اس آسمان پر چڑھ گیا تھا۔ اس نے الہم کو اٹھا کر زمین پر پٹک دیا۔ اس کے اوراق بکھر کر فرش پر پھیل گئے۔ اس کے ساتھ ہی وہ بڑائی۔ ”رکھا کیا ہے اس پھٹے ہوئے الہم میں۔ بوسیدہ ناسور....! ایڈارساں آدم خور....! مرکھپ گئے انسان....! گئی گزری باتوں کا کوئی مول نہیں ہوتا ہے۔“

پھر وہ براہ راست میری جانب مخاطب ہوئی۔ ”اور آپ بھی ناں کبھی کبھی بچوں والی حرکتیں کرتے ہیں۔ کیا ضرورت تھی اس بچی کو یہ سب باتیں بتانے کی اور اس کے ذہن کو مکمل کرنے کی۔ میں نے کتنی بار کہا ہے کہ یہ آپ کا بیٹا ہوا اکل ہے، اسے بھول جائیے۔ ہمارے مستقبل میں اس کا بیوند نہ لگائیے۔ یہ ہماری زندگی کے لیے گہر بن سکتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ جلدی جلدی کمرے سے باہر چلی گئی۔

میں کمرے میں الہم کے بکھرے ہوئے صفحات کو دیکھتا رہ گیا۔

پھٹا ہوا الہم.... پیتا ہوا اکل.... بیوند.... اور....

گرہن! یہ چند الفاظ تھے جو میرے ذہن پر بہت دیر تک کوڑے برساتے رہے۔

خیال کی موت



عادل فراز
نزد سٹ جانس انٹرنیٹ کالج، مفتی گنج بکھنؤ
موبائل: 8896531406

اس کہانی کا خیال ہی امن و قانون کے لئے
خطرہ تھا۔

کئی مہینوں کے بعد اچانک کسی کہانی کا خیال
ذہن میں کوندا تھا۔ نہیں یہ سب کچھ اچانک نہیں ہوا تھا۔
اچانک تو کائنات میں کچھ نہیں ہوتا۔ بغیر علت کے کوئی
چیز وجود میں نہیں آتی۔ تو پھر یہ خیال بھی اچانک ذہن
میں جنم نہیں لے رہا تھا۔ کہانی تو وقت اور حالات کے
زیر اثر ہی ذہن میں کروٹیں بدلتی ہے۔ مگر کہانی کا یہ
نومولود خیال انسانی نومولود کی طرح مادر ذائنگا تھا۔ اور
امن کے خود ساختہ اصولوں کے خلاف بھی۔ ایسے خیال
ہی اکثر انسان کو عیسیٰ کی طرح مصلوب کرواتے ہیں۔
سقراط کو زہر کا پیالہ پینے پر مجبور کر دیتے ہیں اور انسان
نیزہ کی بلندی پر پہنچ کر بھی اس خیال کو بیان کرنے
سے گریز نہیں کرتا۔ کہتے ہیں حق بیانی بھی ایک طرح کا
چمکا ہے جسے لگ گیا جان لیکر ہی چھوٹا ہے۔ مگر مجھے
اپنی جان بہت عزیز تھی۔

کئی بار مسلسل اس خیال کو کہانی کی شکل میں
لکھنے کی کوشش کی مگر ہر بار خیال کی نوعیت نے ذہن کی
نازک رگوں میں دوڑتے ہوئے گرم خون کو برف کی
طرح مجمد کر دیا۔ خوف و ہراس نے دماغ کو شل کر دیا
تھا۔ اگر تخلیق کار کا ذہن ہی اسکا ساتھ نہ دے تو محض
انگلیاں قلم تمام کہانی نہیں لکھ سکتیں۔ میں بھی فقط
ایک خیال کے سہارے کہانی نہیں لکھ سکتا تھا۔
شاید اس خیال کو کچھ نام نہاد حقیقت پسند لوگ
”دیش دروہ“ سمجھیں۔

مجھے یرغمال بنا کر میری ماں کے خلاف نعرے
لگوائے جائیں۔

اپنی ماں کے قدموں میں میری بلی چڑھادی
جائے۔

یا پھر خیال کی طرح میرے وجود کو صفحہ ہستی سے
ہی غائب کر دیا جائے۔ اظہار پر قدغن کی صورت میں
ہر خیال قبر کا کونا معلوم ہوتا ہے۔

کئی دنوں تک کے لئے میرا تخلیقی وجود
ہراس کی چادر تان کر سو گیا۔ خدا نہ کرے اس
خیال کی بھٹک بھی کسی کو پڑے۔ میں نے رائٹنگ
ٹیبیل پر رکھے ہوئے تمام کاغذ کے پلندوں کو
اٹھا کر باہر کوڑے دان میں پھینکوا دیا۔ قلم کو الماری
میں مقفل کر دیا۔ ڈر تھا کہ کہیں بے خبری کے عالم
میں کچھ لکھ نہ بیٹھوں، کچھ ایسا کہ جو امن و قانون
کے خلاف سمجھا جائے۔

مگر میرا تخلیقی و نور مجھے کوستاتا۔ طعنے مارتا۔
”تم کسی سماج میں قلم کار کی طرح زندگی گزار
رہے ہو؟ جہاں خیال کو حقیقت کا روپ دینا بھی قتل سے
بڑا جرم ہو۔ تم مریوں نہیں جاتے۔ جس طرح میں
تمہارے ذہن کے مقبرے میں دفن ہوں۔ تم دفن
کیوں نہیں ہو جاتے۔ مر جاؤ ڈر پوک کہیں کے۔“
اپنے اندر موجود تخلیق کار کے اس طرح
لتاڑنے پر میں چونکا۔

”کیا تم ابھی تک مرے نہیں ہو؟“ میں نے
تخلیق کار سے سوال کیا جو میرے وجود کو مسلسل

جھنجھوڑے جا رہا تھا

”میں زندہ ہوں اور تمہاری بزدلانہ موت پر
کڑھ رہا ہوں۔ تم بولتے کیوں نہیں کہ زبان رکھتے
ہو۔ تم لکھتے کیوں نہیں کہ قلم کی میراث تمہاری
ہے۔“ اسکا لہجہ نشتر کی طرح چبھ رہا تھا۔ میں نے
سوچا شاید وہ موجودہ حالات سے باخبر نہیں ہے۔ یا
مصلحت کوشی کے آداب سے ناواقف ہے۔ میں نے
اسے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔ ”کیا تم واقعی حالات
سے لاعلم ہو۔ کیا تم نے زبان بندی کا فرمان نہیں سنا
۔ تم نہیں دیکھتے کہ کس طرح قلم چشم زدن میں سونے
کے ہو گئے ہیں اور روشنائی چاندی کے پانی میں بدل
گئی ہے۔ ہر طرف باغوں میں بہار کا موسم ہے مگر بھی
خزاں کے سائے بڑھے جاتے ہیں۔ تم نہیں سنتے
کہ قلم کو ازار بند ڈالنے سے زیادہ کی زحمت دینا
منع ہے۔“

”قلم کا وارث انہی حالات میں قلم کی نوک کو
تلوار کی دھار میں بدل دیتا ہے۔ تم لکھو کہ لکھنا ہی ذہن
کی زندگی کی دلیل ہے۔ ورنہ مجھے اپنے وجود سے باہر
نکال کر پھینک دو۔“

”نہیں... نہیں... تم ان حالات میں کہاں
جاؤ گے۔ تم اظہار خیال سے باز نہیں آؤ گے اور کسی
انسان کے قتل کے ذمہ دار ٹھہرو گے۔“

”میں مرنے سے خوف نہیں کھاتا۔ اگر تم
میرے لئے اظہار کا ذریعہ نہیں بن سکتے تو میرے
لئے بے مصرف ہو۔“ اور تخلیق کار میرے ذہن کے

نہاں خانوں میں کہیں کھو گیا۔ شاید وہ رخت سفر باندھ رہا تھا۔

اب بھی وہ کم بخت خیال میرے ذہن میں کلبلاتا ہے۔ حاملہ عورت کی طرح رات بھر درد زہ میں مبتلا رہتا ہوں مگر پھر بھی خیال کی ولادت نہیں ہوتی۔ پھر ایک دن میں نے تہیہ کیا۔ آج ضرور اس خیال کو جنم دوں گا۔ کچھ دیر تک کاغذ پر قلم رکھ کر سوچتا رہا۔ آخر اس خیال کو کہانی کے قالب میں کیسے ڈھالا جائے۔ کہانی کا آغاز کیسے ہو۔ اسکا بیانیہ کیسے ترتیب دیا جائے۔ راست کہانی لکھوں یا اس خیال کو علامتی اور تجریدی پیرائے میں لکھوں۔ خدا نخواستہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں راست بیانیہ پر نقض امن کے جرم میں قتل کر دیا جاؤں یا پھر قید ہو جاؤں۔

”نہیں... نہیں... میں قید ہونا نہیں چاہتا۔ آخر مجھ پر اتنی ذمہ داریاں جو ہیں، ایک روایتی بہانہ مجھے سوجھ رہا تھا، مگر ذہن کسی بہلاوے کے فریب میں آنا نہیں چاہتا تھا۔

سوچا کہ اس خیال کو علامتی پیرائے میں ڈھالنا ہی بہتر ہوگا۔ پھر اس خیال کو پیش کرنے کے لئے مناسب علامتوں کو تلاش کرنے لگا۔ کمزور طبقہ کے لئے کیا علامتیں ہو سکتی ہیں۔ بے بال و پر کبوتر، نیم مردہ بکری، بے سہم چوٹی، حشرات الارض، مظلوم اور دبے کچلے لوگوں کے لئے اس سے بہتر علامتیں اور کیا ہو سکتی ہیں۔ سرمایہ داروں، آمروں اور ظالموں کے لئے، سفید پوش بھیڑیے، سیاہ پوش جنگلی کتے، غلاظت خور سور، جیسی علامتیں استعمال ہوتی آئی ہیں۔

پھر اسی کم بخت خیال نے ٹوکا۔ بد بخت ادیب ان علامتوں کو تم سے پہلے بھی برتا چکا ہے۔ الگ الگ تناظر میں استعمال کیا چکا ہے۔ میں تمہارا اب تک کا سب سے نادر خیال ہوں۔ کیا ان گھسی پٹی علامتوں کے قالب میں چھپا کر مجھے ضائع کر دو گے

کچھ نیا سوچو۔ کچھ نیا پین لاؤ۔ تم کیوں ڈرے ہوئے ہو؟ طاقت و ربطہ جانتا ہے کہ ان علامتوں کا استعمال کب کس تناظر میں کیا جاتا ہے۔ وہ تم سے زیادہ علامتوں کو سمجھتا ہے مگر جان بوجھ کر خاموش رہتا ہے۔ میں مزید ڈر گیا۔ کاغذ پر لکھی ہوئی تمام علامتوں کو قلم زد کیا اور پھر نئی علامتوں کو تلاش کرنے لگا۔ ایسی



علامتیں جو پیچیدہ ہوں۔ جو طاقت و ربطہ نہ سمجھ سکے۔ افہام و تفہیم کی صورت میں مجھے قتل کا اندیشہ تھا۔ نہیں یقین تھا۔

”نہیں نہیں، میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں بھی تو

ایک کمزور آدمی ہوں۔ ایک مزدور آدمی، طاقتور لوگوں کا آلہ کار آدمی، وہی لکھتا ہوں جو وہ لکھواتے ہیں۔“

مجھے ڈر تھا کہ کہیں میرا ذہن پھٹ نہ جائے یعنی موت دونوں صورتوں میں حتمی ہے۔ ذہن پھٹ جائے تو کیا آدمی زندہ رہ سکتا ہے؟

نہیں میں اس خیال کو کاغذ پر محسوس نہیں کر سکتا۔ میں رسوائی کی موت مرنا نہیں چاہتا۔ میں زندان کے سانپ سینڈوں کا رزق نہیں بننا چاہتا۔

”اور اگر ذہن پھٹ گیا تو.....؟“ اندر سے پھر وہی جانی پہچانی آواز آئی۔

”ذہن کی موت آسان ہے۔ وہ مر گیا تو فقط میرا خیال ہی دفنایا جائے گا۔

لیکن اگر میں مر گیا تو.....“ ایک بار پھر میرے وجود پر خوف کا عفریت مسلط ہو گیا۔

اچانک تخلیق کار میرے وجود کی دیواریں توڑ کر باہر نکل آیا۔ وہ چیخا۔ جیسے میں کسی گناہ عظیم کا مرتکب ہوا ہوں۔

”تم مر چکے ہو، ایک لاش ہو تم۔ جانتے ہو فرعون اور یزید پیدا نہیں ہوتے بلکہ سماج کی بزدلی فرعونوں اور یزیدوں کو جنم دیتی ہے۔ تم بھی بزدل ہو۔ میں اب تمہارے وجود کے مقبرہ میں مردوں کی طرح نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ میں زندہ ہوں۔“

اور خیال تخلیق کار کے ساتھ کسی دوسرے وجود کی تلاش میں نکل پڑا۔ ایسا وجود جو زندہ ہو۔

میں پورے وجود کی طاقت کے ساتھ چیخا۔ ”ٹھہرو۔ تم یوں نہیں جا سکتے کیونکہ تم نے میرے ذہن کی کوکھ میں جنم لیا ہے۔“

وہ رکا اور کاغذ پر روشنائی کی طرح پھیل گیا۔ دوسرے دن مجھے سرعام مصلوب کر دیا گیا اور خیال دور کھڑا اپنی کامیابی پر مسکراتا رہا۔

□□□



مینا عرفان

نیا گاؤں ایسٹ، لاٹوش روڈ، کھنؤ
موبائل: 9235707806

امید

میں کہ وہ اسے پیڑ پر چڑھ کر اہلی اور چنگی کیری توڑ کر دے گا۔ پیڑ کو پانچ سال پہلے کی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ اسے آج بھی سب یاد تھا کہ اس نے گھر سے جانے کا فیصلہ کیوں کیا تھا۔

وہ رمضان کا مہینہ تھا۔ گاؤں کے کمیونٹی ہال میں سینئر کی ڈاکٹر شہلا کے گھر پر افطار پارٹی تھی۔ یہ افطار پارٹیوں نے بزنس میٹ کی جگہ لے لی ہے۔ ان کا مقصد روزہ داروں کو افطار کرنا اور ثواب حاصل کرنا اور تجارتی اور سوشل تعلقات کو فروغ دینا زیادہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شہلا کے شوہر بھی شہر کے بڑے بزنس مین تھے۔ ان کی افطار پارٹی میں شہر سے بڑے کاروباری اور مشہور شخصیتیں شامل ہوتیں۔ گاؤں سے بھی دو چار معزز لوگ بلائے جاتے۔ غرض پارٹی بہت شاندار ہوتی تھی۔

پیو کی ماں ریشما ڈاکٹر ٹی صاحبہ کے یہاں جہاز و برتن کرتی تھی۔ اس لئے ایسے موقعوں پر تو صبح سے رات تک کام کرنا پڑتا۔ ادھر کچھ دنوں سے ریشما کو مستقل حرارت رہنے لگی تھی۔ کافی عرصہ سے کھانسی بھی آ رہی تھی۔ وہ شام کو کام سے واپس آ کر نڈھال سی بستر پر پڑ جاتی۔ حالانکہ ڈاکٹر شہلا اس کا علاج کر رہی تھیں مگر کچھ زیادہ افاقہ نہ تھا۔ انہیں شک تھا کہ ریشما کو ٹی بی ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے انہوں نے کچھ ٹیسٹ لکھے تھے جنہیں کرانے شہر جانا تھا اور آج کل پر معاملہ مل رہا تھا۔ پانچوں بیچوں میں پیو سب سے بڑا تھا اور کافی حساس بھی۔ گو وہ ابھی صرف تیرہ چودہ برس ہی کا تھا مگر

چھوٹا بھائی منا ہے گو کہ اب منا بڑا ہو گیا تھا۔ اب پیو نے دوسرا سوال داغا۔

’تمہیں پیو بھیا کیسے لگتے ہیں؟‘
مینا بغیر دیر لگائے جھٹ سے بولا۔

’وہ تو بہت اچھے ہیں۔ ابھی وہ شہر گئے ہوئے ہیں۔ اما کہتی ہیں کہ جب وہ شہر سے آئیں گے تب ہم سب کے لئے ڈھیر سا سامان لے کر آئیں گے۔ نئے کپڑے، جوتے، کھلونے اور تب ہماری اصلی عید ہوگی اور ہم لوگ خوب آرام سے رہیں گے۔ اس نے یہ بھی بتلایا کہ اما کہتی ہیں کہ تم مسجد جاتے ہو تو پیو بھیا کے جلدی آنے کی دعا مانگا کرو۔ پھر اس نے بڑی معصومیت سے اس سے سوال کیا کہ کیا آپ شہر سے آئے ہو؟ کیا پیو بھیا بھی آنے والے ہیں۔ سب لوگ کہہ رہے ہیں کہ کچھ دن بعد عید آنے والی ہے تو کیا اب ہماری اصلی والی عید ہوگی؟ اس نے پیو سے تائید چاہی۔ ’بولو، پیو بھیا آجائیں گے نا؟‘ پیو نے اسے سینے سے کس کر بھینچ لیا اور پھر سے اسے حیرت زدہ چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

اسے اما کو دیکھنا تھا۔ گھر کے دروازے بھڑے ہوئے تھے۔ اس کی چوڑی چوڑی جھریوں میں سے اس نے اندر جھانکا، اما آنگن میں سل بٹے پر کچھ بیٹ رہی تھیں اور ٹین شیڈ کے نیچے چٹائی پر ایک لڑکی مشین پر کچھ سی رہی تھی۔ یہ شاید منی بلکہ یقیناً منی ہی تھی۔ وہ اب بڑی بڑی سی لگ رہی تھی۔ منی اس سے تین سال چھوٹی تھی اور ہمیشہ اس کے آگے بیچھے لگی رہتی۔ اس کے سارے کام کر دیتی۔ صرف اس لالچ

اسٹیشن سے باہر آ کر پیو نے منا تکہ یا رکشہ تلاش کرنے کے لئے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ جب کچھ نظر نہیں آیا تو وہ پیدل ہی گاؤں کی طرف چل دیا۔ سامان بھی زیادہ نہ تھا اور گھر بھی اسٹیشن سے بہت دور نہیں تھا۔ بچپن میں تو وہ لوگ اسٹیشن کے پاس لگے پیڑوں سے آم اور اہلی توڑنے روز ہی آتے تھے۔ دور سے اسے گھر کے قریب نیم کا پرانا تناور درخت ویسا ہی گھٹا اور ہرا بھرا نظر آیا جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ اس پیڑ کی گھنی چھاؤں تلے وہ اپنے دوستوں کے ساتھ گرمیوں کی بھری دوپہر میں کچھ کھلایا کرتا تھا۔ لڑکیاں مضبوط شاخوں پر جھولا ڈال کر باری باری جھولتی تھیں اور گاؤں کی عورتیں چادر بچھا کر پیڑ کی گھنٹی چھاؤں میں تھوڑا آرام کرتی تھیں۔ آج بھی کئی بچے درخت کے نیچے کچھ کھیل رہے تھے۔ وہ رک کر انہیں دیکھنے لگا۔ ایک بچے نے دوسرے کو مخاطب کیا۔

’مینا! یہ کچھ میرا ہے۔‘

پیو نے چونک کر منا کو دیکھا، کچھ اپنا پن سا محسوس ہوا۔ وہ منا کے پاس گیا۔ بچوں نے کھیل بند کر دیا اور سوالیہ نظروں سے اس اجنبی کو دیکھنے لگے جو زبردستی ان کے کھیل کے درمیان مغل ہو رہا تھا۔ پیو نے اپنا شک دور کرنے کے لئے منا سے معلوم کیا کہ تم کتنے بھائی بہن ہو۔ سوال پوچھنے کی دیر تھی کہ منا کا ٹیپ چالو ہو گیا۔

’میرے سب سے بڑے بھیا ہیں پیو بھیا، پھر منی اپنی، گڈو بھائی پھر میں اور میرے سے چھوٹی گڑیا۔‘ اس کے بعد پیو کو یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ اسی کا

حالات نے اسے کافی سنجیدہ بنا دیا تھا۔ اس بیماری کی حالت میں اسے ماں کا کام پر جانا بالکل پسند نہیں تھا، اس نے روکا بھی مگر ریشما جانتی تھی کہ اگر وہ اپنے کام پر نہیں جائے گی تو حالات اور خراب ہو جائیں گے۔ آج تو ریشما کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب تھی مگر آج ڈاکٹر نے صاحبہ کے یہاں افطار پارٹی ہے اور جانا لازمی ہے ورنہ وہ ناراض ہو گئیں تو مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ عید بھی سر پر رکھی ہے۔ ان ہی کا سہارا ہے۔ وہ عید بقر عید پر کپڑے لٹے بھی دیتی ہیں اور کچھ اوپر سے بھی خیرات زکوٰۃ نکالتی ہیں جس سے گھر کے دن کام بنتے ہیں۔ یہی سوچ کر ریشما نے ہمت جٹائی اور چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی گوکہ ہمت جواب دے رہی تھی۔ اس حالت میں ماں کو کام پر جاتے دیکھ بیچو بھی ساتھ ہو لیا۔ ماں کا کچھ تو ہاٹھ بنا ہی لے گا۔ ریشما نے کوٹھی پر پہنچ کر جھاڑ پوچھا کیا۔ پوپو سامان ہٹانے لگانے کا کام کر کے ہاتھ بنا تا رہا۔ پھر ریشما برتن دھونے بیٹھی تو پوپو نے کہا، تم برتن مانجھو، میں دھوتا ہوں۔ اسی دوران پوپو کے ہاتھ سے ایک ڈش پھسل کر نیچے گر گئی۔ برتن ٹوٹنے کی آواز پر ڈاکٹر نے چکن میں آئیں اور اپنی قیمتی ڈز سیٹ کی ڈش ٹکڑے ٹکڑے دیکھ کر ان کا پارہ چڑھ گیا۔ انہوں نے اپنے خاص مہمانوں کے لئے یہ ایمپورٹڈ ڈز سیٹ نکالا تھا۔ غصہ سے لال ڈاکٹر نے بری طرح ریشما پر پرس پڑیں۔ ریشما نے پوپو کو بچانے کے لئے الزام اپنے سر لے لیا تھا اور چپ چاپ سر جھکائے سب برداشت کر رہی تھی مگر پوپو سے یہ برداشت نہیں ہو اور وہ اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے باہر لایا۔ اب تو کام نہیں کرے گی۔ اتنی بیماری اور تقاہت میں بھی تو کام کرنے آئی اور کسی کو اس بات کا احساس بھی نہیں۔

پیسہ کمانا تھا کہ واپس گاؤں آکر خود کا کوئی کام کر لے اور ماں بھائی، بہن آرام سے رہ سکیں۔

اسٹیشن پر جو گاڑی سب سے پہلے آئی، وہ اسی میں سوار ہو گیا۔ بغیر یہ معلوم کئے کہ یہ کہاں جا رہی ہے پھر تو پانچ سال تک پوپو شہروں شہروں بھٹکتا رہا۔ کئی طرح کے کام کئے مگر جیسا سوچا تھا ویسا نہ ہو سکا۔ ہر شخص اتنا خوش قسمت نہیں ہوتا کہ اس کی خواہش پوری ہو۔ کافی محنت کے باوجود وہ اتنے پیسے جمع نہیں کر سکا



کہ واپس گاؤں جا کر کوئی چھوٹا موٹا کام کر سکے۔ ان پانچ سالوں میں اسے اپنے گھر کی بے پناہ یاد آتی تھی مگر کسی طرح دل کو سمجھا لینا تھا کہ کچھ دن اور کوشش کر لیتے ہیں۔ مگر ان دنوں اس سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ایک بار ماں کی گود میں سر رکھ کر سکون سے سونا چاہتا

تھا۔ ماں اکثر اس کا سر گود میں رکھ کر جب اس میں جھوٹ موٹ کے جوں دکھتی تو اسے فوراً نیند آ جاتی۔

آخر کار اس نے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ گھر والوں کے ساتھ عید منانے کے تصور ہی سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ اتنے دنوں میں اس نے جو کچھ بھی پس انداز کیا تھا، اس جمع پونجی سے ماں اور بھائی بہن کے لئے سامان خریدا اور ٹرین میں سوار ہو گیا۔ راستے بھر اس نے ماں سے نہ جانے کتنی باتیں کر ڈالیں۔ ان کے شکوے سنے، اپنی روداد بتائی۔ بھائی بہنوں سے بھی ڈھیر سی باتیں ہوئیں اور راستہ انہیں خیالات میں کھوئے ہوئے کٹ گیا۔ گاؤں میں مناسے ملنے کے بعد اس کی باتیں پوپو کے کانوں میں گونج رہی تھیں کہ جب بھیا آئیں گے تو ہماری سچی عید ہوگی۔ ہم لوگ آرام سے رہیں گے۔ گھر کے دروازے پر کھڑا وہ سوچ رہا تھا کہ واپس آ کر اس نے کیا صحیح کیا؟ انہیں خیالوں میں الجھا تھا کہ اسے گلی میں آہٹ سنائی دی۔ وہ دروازے سے ہٹ کر آگے بڑھ گیا۔ سامنے سے اسکول ماسٹر آ رہے تھے۔ وہ کافی کمزور نظر آ رہے تھے۔ پوپو کو یاد تھا کہ وہ ہمیشہ اس کی ماں سے کہتے تھے کہ تمہارا بیٹا بڑا ہونہار نکلے گا اور آج وہ اسے پہچان تک نہیں پارہے تھے۔

پانچ سال میں وہ بھی کافی بدل گیا تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر ویسے تو اتنی پختہ نہیں ہوتی مگر دنیا کے سرد و گرم کا مقابلہ کرتے کرتے پوپو اپنی عمر سے کہیں زیادہ کا لگنے لگا تھا اور اس کی سمجھ میں ایک بات تو اچھی طرح آ چکی تھی کہ زندگی ایک امید کے سہارے گزاری جاسکتی ہے۔ اس کے ذہن میں بس یہی بات گردش کر رہی تھی کہ کیا وہ اپنے گھر والوں سے یہ امید چھین لے گا۔ کم از کم وہ اتنا تو کر ہی سکتا ہے کہ بہتر دنوں کی آس میں انہیں جینے دے اور وہ آنکھوں کو صاف کرتا ہو جن کا پانی بار بار پوچھنے پر بھی کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا، تقریباً دوڑتے ہوئے اسٹیشن والے راستے پر جا رہا تھا۔

□□□

لکھنؤی تمدن کا آغاز

کوکب قدر سجاد علی مرزا

لکھنؤ ریزیڈنسی کی عمارت انہیں آصف الدولہ کی بنوائی ہوئی ہے۔ اس کا خمیازہ بھی سب سے پہلے انہیں کو اٹھانا پڑا۔ آصف الدولہ کی تفریح اور دلچسپی کا سامان مہیا کرنا ریزیڈنسی والوں کی خاص توجہ کا مرکز تھا۔ ولایتی کھلونوں، گھڑیوں اور نودرات سے نواب کو بڑی دلچسپی تھی۔ انگریز تاجر منہ ماگے داموں پر اپنا مال فروخت کرتے اور اکثر محض ریزیڈنٹ کی خاطر نواب کو ایسی چیزیں خریدنا پڑتیں جن کی نواب کو مطلقاً ضرورت نہ ہوتی یا ایسے لوگ نوکر رکھوائے جاتے جو انگریزوں کے پست طبقے سے ہوتے۔ نواب کی تفریحوں میں برابر سے شریک ہونا نواب کی خوشنودی حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ تھا۔ نواب کے جانوروں پر جہاں اتنی کثیر رقم خرچ ہوتی کہ اس سے ایک فوج کی کفالت ہو سکتی تھی وہاں ایک ہزار کتوں کا بھی ذکر ملتا ہے جو اس غیر ملکی اثر کے تحت جمع ہوئے تھے۔ اپنے معزز مہمانوں کی خاطر داری میں آصف الدولہ نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ انہیں لونا چارہ ہے۔ فریاد کرنے پر مرکزی حکومت نے کچھ چارہ جوئی بھی کی لیکن اس وقت جب مرض لاعلاج ہو چکا تھا۔ لکھنؤی رنگ میں مغربی رنگ کی آمیزش اسی دور سے شروع ہوئی اور لکھنؤ مشرقی مغربی تہذیب کا اس دور میں سب سے بڑا سنگم بن گیا۔

اودھ کے باہر سارے ہندوستان میں قتل و غارت کا بازار گرم تھا لیکن اودھ میں نہ صرف چین کی بانسری بج رہی تھی بلکہ دولت کی افراط اور عیش و نشاط کی

’نہ روم، نہ تھینس، نہ قسطنطنیہ اور نہ ہی کوئی دوسرا شہر اتنا دلکش اور دلفریب ہوگا جتنا یہ شہر‘

۱۸۵۸ میں لندن کے ٹائمس اخبار کے نامہ نگار ولیم رسیل نے یہ جملہ لکھنؤ کے لئے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا تھا۔ سیدھے سادے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ نوابین اودھ کا عہد اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ پورے ہندوستان کے افق پر غالب تھا۔ لکھنؤ شہر کی شان و شوکت کے قصے عالمی سطح پر مشہور ہونے لگے تھے۔ نواب شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے دور کے لکھنؤ کو جتنی مقناطیبت حاصل ہوئی، اتنی شان دہی دوسرے کسی شہر کو نصیب ہوئی ہو۔

پھر وہ دور بھی آیا جب شاداب کلیاں باؤموم کے جھونکوں سے کھلانے لگیں اور سارا ماحول نمبر پذیر ہو گیا۔ پرانی قدروں پر نیا مزاج حاوی ہونے لگا تب اس شہر کی ہیئت بدل گئی۔ لکھنؤ اپنے شاندار ماضی سے مستقل نبرد آزما رہتا ہے، دور کوئی بھی ہو، شعراء، ادباء اور فنکاروں کی دلچسپی اب بھی اسی گزشتہ لکھنؤ میں زیادہ نظر آتی ہے۔

’داسن کو چھوڑتی ہی نہیں لکھنؤ کی خاک‘

اسی کے پیش نظر ’نیا دور‘ کے ہر شمارے میں ’گزشتہ لکھنؤ‘ کے عنوان سے ایک نہ ایک ایسی تحریر پیش کی جائے گی جس میں خطہ اودھ اور بالخصوص لکھنؤ کے ادبی و تہذیبی سماج کی عکاسی نظر آئے۔ مقصد بازیافت ہے۔ اس سلسلہ کی آٹھویں کڑی کے طور پر کوکب قدر سجاد علی مرزا کی کتاب ’واجد علی شاہ کی ادبی و ثقافتی خدمات‘ سے ایک تحریر ’لکھنؤی تمدن کا آغاز‘ حاضر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ سلسلہ پسند کیا جائے گا۔ ’نیا دور‘ ایسی تمام تحریروں کا خیر مقدم کرے گا جن میں گزشتہ لکھنؤ کی جھلک نظر آئے۔ (ایڈیٹر)

شجاع الدولہ کو فنون لطیفہ اور صنم نازک سے بھی اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی فن حرب اور عروس مملکت سے۔ آصف الدولہ نے باپ سے صرف علم و ادب کی سرپرستی کا ذوق حاصل کیا اور عروس مملکت کی ناز برداریوں کو تنگ آ کر جلد ہی ان لوگوں کے سپرد کر دیا جو اسی کے خواستگار تھے۔ انگریزوں کے نزدیک جو عہد نامے نواب شجاع الدولہ کے ساتھ ہوئے تھے انہیں کے ساتھ ختم ہو گئے۔ اودھ میں ریزیڈنٹ اور مددگار فوج رکھنے اور محصول تجارت معاف کرنے کا عہد نامہ بھی انہیں سے تھا۔ نئے بندوبست (۱۷۷۵ء) کے تحت انگریزوں نے اپنے اختیارات میں مزید اضافہ کیا اور آصف الدولہ کو آمادہ کر لیا کہ فوج برطرف کر دی جائے۔ غیر ملکی ملازم رکھے جائیں تو کمپنی کی اجازت سے رکھے جائیں اور کمپنی کی تجارت کو فروغ دینے کے لئے مراعات میں اضافہ کیا جائے۔ آصف الدولہ

’اپنے مغربی دوستوں کے اطاعت کیش دوست تھے۔ وہ ان کے اشاروں پر چلتے اور ان کے مشوروں کے آگے کسی کی نہ سنتے۔‘

جہاں دیدہ اور صاحب اقتدار ماں بہو بیگم صاحبہ کی موجودگی میں آصف الدولہ بے بس تھے۔ انہوں نے مسند نشینی کے فوراً ہی بعد ۱۷۷۵ء میں لکھنؤ کو اپنا مستقر قرار دیا اور ایران و ہندوستان کی جس مخلوط تہذیب کا آغاز فیض آباد سے ہوا تھا لکھنؤ آتے آتے اس میں انگریزیت کا جزو بھی شامل ہو گیا۔

فراوانی کے سبب اربابِ طرب و اصحابِ علم و فن کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا اور معمولی سے معمولی انسان بھی یہاں آتا تو فکرِ معاش سے آزاد ہو جاتا تھا۔ جس کو نہ دیں مولا، اس کو دیں آصف الدولہ اس زمانے کی مشہور کہوت ہے۔ شجاع الدولہ کی بے وقت موت سے فیض آباد کو تو شنا جہاں آباد بننے کا موقع نہ ملا لیکن ان کے لڑکے نے

’چند ہی روز کے اندر ساری دنیا کی دھوم دھام اپنے یہاں (لکھنؤ میں) جمع کر لی، ان کا حوصلہ بس یہی تھا کہ نظام حیدر آباد ہوں یا ٹیپو سلطان، کسی دربار کا کروفر کسی کی شوکت و حشمت میرے دربار سے زیادہ نہ ہو سکے۔‘

چنانچہ ایسا ہی ہوا اور شاگرد پیشہ افراد کا کیا ذکر مغلیہ خاندان کے شاہزادے تک بن بلائے آئے اور آصف الدولہ نے گرافنڈر نذرانے ان لوگوں کے بھی مقرر کئے۔ دلی دربار کی مالی امداد کے صلے میں۔ وزیر الممالک آصف الدولہ نواب محمد بیگی خان بہادر ہزبر جنگ خطاب اسی دربار نے عطا کیا تھا۔ آصف الدولہ کی قائم کی ہوئی روایت ان کے بعد بھی باقی رہی اور دوسرے آنے والے شہزادوں کے استقبال میں سعادت علی کا قدم یا نہ انداز سے ساتھ رہنا اور بذات خود مگس رائی کرنا ظاہر کرتا ہے کہ انگریزوں کے غارت کرنے والے اثر کے باوجود فرماں روا یان اودھ میں رتبہ شناسی کی خوباتی تھی۔

شاہزادوں کو شاہزادوں کا سا احترام، شرفائے لکھنؤ نے اور شاعروں کو شاعروں کی سی دادا شعرائے لکھنؤ نے دی اور یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ مہاجر ہیں، ان کی عنایتوں کے طلبگار بن کے آئے ہیں۔ لکھنؤ والوں کا یہ اخلاق اور کشادہ پیشانی اجنبیوں کی وحشت دور کرنے اور ان کے دلوں کو تسخیر کرنے کے لئے عدیم المثال سمجھی جاتی تھی۔ احساس برتری کے شکار افراد اگر اسی آؤ بھگت کے بعد بھی لکھنؤی ماحول کو برا سمجھتے رہے

تو یہ ان کا فعل تھا اور رفتہ رفتہ اسی اتانیت کے رد عمل اور عیش کوشی کی تلاش میں زبان، شاعری، ادب لباس، غذا، وضع قطع غرض یہ کہ زندگی کے ہر شعبے میں ایجادات اور تکلفات کی ابتدا ہوئی۔ خان آرزو جن سے دلی کی ادبی دنیا میں اجالا ہوا، لکھنؤ آنے والوں میں ہراول دستے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سودا، میر، سوز، میر حسن، انشاء، جرأت، مصحفی اور ان کے ہم عصر بیسیوں چھوٹے بڑے شاعر لکھنؤ آئے اور یہاں کی ادبی فضا بنانے اور بگاڑنے کے کام آئے۔ میدان جنگ میں لڑنا لڑانا انگریزوں کی بدولت ختم ہو چکا تھا لیکن اپنی برتری ثابت کرنے کے کی خواہش انسانی فطرت کا جزو ہے۔ لکھنؤ والوں نے اپنے اسی جذبے کی تسکین کے لئے کٹکڑوں اور بیڑوں کی لڑائی سے کشمیر یوں اور شاعروں کی ہنگامہ آرائی تک ہر میدان میں نام حاصل کیا اور اس طرح کی دلچسپیاں لکھنؤی تہذیب کا جزو بن گئیں۔

شیعیت کا عروج

شیعہ عقائد کی تبلیغ کو لکھنؤی تمدن کی تشکیل، ترویج، نیک نامی اور بدنامی میں اتنا گہرا دخل ہے کہ اس تمدن کے دو نادر کارنامے آصف الدولہ کا امامباڑہ اور میر انیس کے مرتبے، اسی تحریک کے مرہون منت ہیں اور لکھنؤ جو آج بھی شیعیت کا مرکز اور شیعہ عقائد کی تعلیم کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے وہ اسی تحریک کی بدولت ہے۔ آصف الدولہ کے وقت تک شیعہ علماء میں کوئی مجتہد نہ تھا۔ کوئی نماز جماعت الگ نہ ہوتی تھی۔ تعزیہ داری میں کوئی امتیازی فرق نہ تھا۔ دکن گجرات اور مرشد آباد وغیرہ میں شیعہ ریاستیں تھیں لیکن ان میں وہ جوش و خروش نہ تھا کہ اپنے عقائد کی تبلیغ میں سعی کرتیں۔ قدرت نے یہ امتیاز سرزمین اودھ کے لئے اٹھا رکھا تھا کہ جب آصف الدولہ لکھنؤ کو آباد کریں تو مولوی دلدار علی (المتوفی ۱۲۳۵ھ مطابق ۱۸۲۰ء) نصیر آباد سے

یہاں آئیں اور اسی دربار کی سرپرستی میں علم دین سے فراغت حاصل کر کے تبلیغ دین کی فکر کریں۔

’ان تمام خدمات (شیعہ عقائد کی اصلاح، شیعہ جماعت کی تنظیم اور ضخیم تالیفات کے ذریعہ مخالف جماعتوں کا الگ الگ مدلل جواب) میں سے ہر ایک میں جتنا کام غفرانمآب نے بذات خود کیا ہے۔ وہ کسی ایک شخص کی پوری زندگی کا کارنامہ بن سکتا تھا چہ جائیکہ ان تمام خدمات کو مجموعی حیثیت سے بوقت واحد انجام دینا۔ یہ بغیر مخصوص تائید و توثیق الہی کے خیال میں نہیں آسکتا۔ ہندوستان میں جہاں کہیں بھی علم ہے اس کی انتہا غفرانمآب طاب ثراہ تک ضرور ہوتی ہے۔‘

فرقہ شیعہ کی تنظیم میں پہلی نماز جماعت ۱۳ رجب ۱۲۰۰ھ مطابق ۱۸۶۱ء اور پہلی نماز جمعہ ۲۷ رجب ۱۲۰۰ھ مطابق ۱۸۶۱ء کو بنائی گئی ہے اور تعزیہ داری کی موجودہ شکل اور مقبولیت بھی جناب غفرانمآب سے منسوب ہے۔

’اور ان رواہم (عزاداری کے موجودہ رواہم) کو اتنا عام کر دیا کہ گھر گھر مجلس اور گلی گلی تعزیے اٹھنے لگے۔ اس طرح انہوں نے شیعوں کی تعزیہ داری کو ایک نئی شکل دے کر عام مسلمانوں سے الگ کر دیا گیا اور اس سے مذہبی تبلیغ، قومی تنظیم اور شیعہ تمدن کی تشکیل کی۔‘

شیعیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا جیتا جانتا ثبوت لکھنؤ کی سرزمین ہے جس کے کھنڈر آج بھی اس کے پرانے باشندوں کی عقیدت مندی یاد دلا رہے ہیں۔ عراق، نجف، کربلا اور کاظمین جیسے دیگر مقامات پر شاید ہی شیعوں کی کوئی زیارت گاہ ایسی ہو جس کی شبیہ لکھنؤ میں نہ بنائی گئی ہو۔ آصف الدولہ کے وقت تک ان کے اسلاف اور دوسرے رئیس اپنی ابدی آرام گاہ کے لئے مقبرے تعمیر کرواتے تھے۔ آصف الدولہ اپنے امامباڑے (تعمیر ۱۲۰۵ھ مطابق ۱۷۹۱ء) میں دفن ہوئے (انتقال ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء) اور اس

کہ وہ اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیں لیکن شجاع الدولہ نے صاف انکار کر دیا۔ ان کی سیاست کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ کام نہ کریں جس میں دوسروں کو فائدہ اور خود کو ایک بے معنی لقب کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہو۔ غازی الدین حیدر تک حالات بہت بدل چکے تھے۔ اب نہ وہ مملکت تھی اور نہ وہ فوج، بگڑے ہوؤں کو اور بگاڑنے کے لئے اس سے عمدہ طریقہ نہ تھا کہ اب بادشاہ بنا دیا جائے۔ بادشاہ بننے سے پیشتر غازی الدین حیدر دو کروڑ روپے اور بہت کچھ امداد کمپنی کو اس کی جنگوں کے لئے مہیا کرا چکے تھے۔ ابھی باپ کے جمع کئے ہوئے کئی کروڑ روپے خزانے میں محفوظ تھے۔ شاہانہ طمطراق کے لئے یہ رقم بہت کافی تھی۔ ۹ اکتوبر ۱۸۱۹ء کو غازی الدین حیدر بادشاہ بنا دئے گئے۔ شہنشاہ انگلستان کا بھیجا ہوا تاج اور لبادہ ایک ایسا اعزاز تھا جس کے بعد انگریزوں کی خیر خواہی کسی تشریح کی محتاج نہ رہی لیکن اس وقتی واہ واہ اور بقول بعضے لارڈ ماٹرا کی انتقامی کارروائی سے قطع نظر دلی سے وہ برائے نام رشتہ بھی ٹوٹ گیا جس میں دونوں کی بھائی تھی۔ اودھ والے سمجھے کہ انگریز سلطنت کے خیر خواہ ہیں، وہ باقی رہیں گے تو یہ سلطنت بھی ترقی کرے گی۔ سلطنت نے ترقی تو کی لیکن یہ ترقی عیش و عشرت، تصنع اور مخالفت کی ترقی تھی۔ دلی سے صاحبان کمال کی آمد کا سلسلہ غازی الدین حیدر کے زمانے سے تقریباً منقطع ہو گیا اور جن لوگوں نے اسی لکھنؤی ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں ان کمالات کے اظہار سے گریز کرنے لگے جن میں دلی والوں کی جھلک پائی جاتی تھی۔

بندگی اور بے چارگی

رعایا اور حکومت کی بھلائی کے نام پر اودھ کے فرمانرواؤں کو مجبور اور کمزور بنانے کا سلسلہ آہستگی اور استقلال کے ساتھ عہد شاہی میں بھی جاری رہا۔ فرق تو یہ کہ ۱۷۷۵ء کے بعد سے سرپرستی کا دور شروع ہوا اور

اس کی زد سے محفوظ نہ تھا۔ اگر وہ کبھی غصے میں حکم دیتا کہ مجتہد العصر کا گھر توپ سے اڑا دیا جائے تو لوگ اس کے گل پر بھی توپ کھڑی کر دیتے کہ بادشاہ دین کا گھر تو ڈھایا جائے اور بادشاہ دنیا کا محل کھڑا ہے۔ لیکن یہ ترقی درحقیقت مذہب کی ترقی نہ تھی، ویسا ہی جنون تھا جس نے ایک وقت میں مغلیہ سلطنت کی جڑوں کو کھوکھلا کیا اور اب اودھ کی باری تھی۔ غیر مسلم امراءے سلطنت کو بچ بچانا، ناخوابت اندیش حکمرانوں کو جوش دلانا تھا کہ اعلیٰ ترین عہدہ مسلم افراد کو ملنا چاہئے اور اس کی ذمہ داری بھی انگریزوں کے سر ہے۔ عہد آصف الدولہ میں راجہ جھاؤل لال زبردستی عہدے سے معزول کئے گئے اور روایت ہے کہ اسی غم میں آصف الدولہ کا انتقال ہوا۔ جھاؤل لال کے جانشین علامہ تفضل حسین خاں مقرر ہوئے۔ علامہ مصوف کا پہلا کارنامہ وزیر علی خاں کی معزولی اور بربادی اور دوسرا کارنامہ سعادت علی خاں میں ملک کا بٹوارہ تھا۔ سعادت علی خاں نے جلد ہی تفضل حسین خاں کو بچھڑا دیا اور اس کا انداز سے نمک حراموں کو جن سے دل کھٹکتا تھا، آہستہ آہستہ سزا کو پہنچایا لیکن سعادت علی خاں کے جانشین اتنے دور اندیش نہ تھے۔ وزیر کے ہاتھوں تباہی میں پڑنا گویا روایت میں داخل ہو چکا تھا۔

دلی سے قطع تعلق

اودھ کیا کسی بھی صوبے کی صوبیداری صوبیدار کی ذاتی ملکیت نہ ہوتی تھی کہ اس کے وارث پر منتقل ہو جائے۔ مرکزی حکومت کو اختیار تھا کہ جب اور جسے چاہے یہ منصب عطا کرے۔ صفر جنگ نے اسے دو کروڑ روپے نذر دے کے حاصل کیا اور اسی سبب سے اودھ کی مملکت زرخیز ذاتی ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ شجاع الدولہ کو مرکزی حکومت کی تائید کی بھی ضرورت نہ ہوئی۔ مرکزی حکومت اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ وہ خود شجاع الدولہ کی محتاج تھی۔ پستنگر نے شجاع الدولہ کو مشورہ بھی دیا تھا

وقت سے ان کی اولاد انہیں کا اتباع کرتی رہی۔ بجائے مقبروں کے تعزیئے خانوں کی تعمیر میں ایک خوبی یہ بھی مضمر تھی کہ ایام عزاء میں ان میں بڑی رونق رہتی اور نہ صرف امام باڑے روشن ہوتے بلکہ خاندان کا نام بھی روشن رہتا۔

تو لا یعنی اہل بیت اطہار سے اظہار محبت اور تبرا یعنی دشمنان اہل بیت سے اظہار برأت اس شیعہ عقیدے کے نمایاں اصول تھے جس نے آصفی لکھنؤ سے رواج پایا اور علو اور تصنع پسندی کے سبب ان میں بھی بدعتیں پیدا ہو گئیں۔ شاعری میں تو لا کا اظہار مختلف اصناف سخن میں ممکن ہے لیکن جس صنف نے خصوصیت سے مقبولیت حاصل کی، اسے مرثیہ کہا گیا ہے۔ اسی طرح تبرے کا اظہار بھی مختلف عنوان سے ہوا ہے لیکن ہرزیہ گوئی لکھنؤی شعراء کا انیازی کارنامہ ہے۔ تصوف کی شیعہ عقیدے میں گنجائش نہیں۔ لکھنؤ کی مذہبی شاعری میں تصوف کی قائم مقامی تبرا اور تو لا نے کی۔

شیعیت کے عروج کے ساتھ انگریزوں نے شیعہ فقہ کے اس اصول کو سیاسی اغراض کے لئے خصوصیت سے اہمیت دی اور مسند نشینی کے باب میں ان کے فیصلے ہمیشہ شاہی خاندان کی پریشانی کا باعث رہے۔ آصف الدولہ کا ہر سال ہولی میں حصہ لینا اور ان کے نائب جھاؤل لال کا عظیم الشان اما باڑہ تعمیر کرنا اسی مذہبی رواداری کا مظہر ہے جس کی برہان الملک اور صفر جنگ سے ابتدا ہوئی تھی۔ غفرانمآب اور آصف الدولہ کے بعد مذہب سے بے تعصبی اور ریاست سے غیر جانبداری کی روایتیں ختم ہونا شروع ہوئیں اور نصیر الدین حیدر کے عہد تک لکھنؤی تمدن میں وہ جراثیم داخل ہو چکے تھے جو مذہب کے زیر اثر آگے بڑھتے اور انسانیت اور ریاست کو مجروح کر دیتے ہیں۔ بظاہر یہ مذہب کی ترقی تھی کہ کتنے ہی ہندو مسلمان اور کتنے سنی شیعہ ہو گئے، اور قابل تعریف تھی کیونکہ بادشاہ بھی

۱۸۳۷ء میں یہ حق بھی حاصل کر لیا کہ ضرورت سمجھیں تو سلطنت کا الحاق کر لیں۔ وزارت کے عہدے سے شاہی منصب تک اہل اور نااہل ہر طرح کے حکمران اودھ کے تخت پر بیٹھے، تنگ دل اور بلند حوصلہ ہر طرح کے گورنر جنرل کمپنی کی پالیسی کو آگے بڑھاتے رہے لیکن اگر کوئی تبدیلی نہ آئی تو فرمانروایان اودھ کی بندگی اور بے چارگی میں۔ انگریزوں کی اطاعت باشندگان اودھ کی سرشت میں داخل ہو چکی تھی اور اگر کبھی کسی حکمران کو حوصلے سے احتجاج کا خیال بھی آتا تو دربار کی سازشیں کسی امید افزا نتیجہ کے حاصل کرنے میں مائع ہوتیں۔ بادشاہ کا ایسے اشغال میں منہمک رہنا انگریزوں کے اقتدار اور درباریوں کے اختیارات میں حارج نہ ہو، ہر فریق کے اطمینان کا موجب ہوتا تھا اور کوشش کی جاتی تھی کہ حالات ایسے موافق رہیں کہ کسی فریق کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ مذہبی اور ثقافتی سرگرمیاں انسان کو باطن مرغوب ہوتی ہیں اور ان سے کسی نقصان کا احتمال بھی نہیں ہوتا۔ محفلوں، مجلسوں، میلوں، تماشوں وغیرہ کا اہل ہند کو قدرتی شوق اور سونے کا سہاگہ مذہب اور عیش و نشاط کی برکتیں۔ حکمران اور رعایا کی ان معاملات میں دلچسپی برقرار رکھنے اور اس کو فروغ دینے کی خاطر وہ اختراعیں برتی گئیں جن کا بصورت دیگر خیال بھی ممکن نہ تھا۔ سلطان العلماء سید محمد صاحب جیسا مجتہد واجد علی شاہ جیسا بادشاہ، رجب علی بیگ سرور جیسا نثار، میر انیس جیسا مرثیہ گو، نواب مرزا شوق جیسا مثنوی نگار، آتش اور ناسخ جیسے شاعر، کاکا اور بندادین جیسے رقاص، یہ سب اسی تہذیب کے پروردہ ہیں جسے ہم لکھنؤی تہذیب کے نام سے نیک نام یاد نام کرتے ہیں اور اگر یہ تہذیب نہ ہوتی تو یہ تسلیم کرنے میں بھی تکلف نہ ہونا چاہئے کہ غالباً وہ شہ پارے بھی وجود میں نہ آتے جو ہندوستانی تہذیب و تمدن کی تاریخ میں امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔ ان حضرات کی خدمات اس ایک صدی کی پر تکلف زندگی کا لازمی نتیجہ تھیں جس نے مذہب اور اخلاق، میل ملاپ،

بات چیت، رہن سہن غرض یہ کہ زندگی کے ہر شعبے میں تکلف اور نفاست کو انتہا تک پہنچا دیا۔ ملک کی سیاست کا ملک کی تہذیب کا یہ رد عمل کوئی نئی بات نہ تھی۔ ندرت اگر کچھ تھی تو اس میں کہ بادشاہ صرف نام کا بادشاہ تھا۔ اختیارات اور ذمہ داریاں اسی کے پائے نام تھیں لیکن ریزیڈنٹ اگر مناسب سمجھتا تو جیرتسمہ پاکی صورت اپنی مرضی پر چلاتا اور اس طرح طرح کی دو عملی دونوں کی بدنامی اور انتقامی کی خرابی کا باعث ہوتی۔ بادشاہ اور ریزیڈنٹ کا ہم خیال ہونا دونوں کے نیک ہونے اور ملک کی مصلحتوں پر مبنی تھا اور ایسا اتفاق بہت ہی کم ہوا ہے۔ اختلاف کی صورت سے بادشاہ کا اپنی ضد سے باز آنا یا ریزیڈنٹ کا اپنے فیصلے پر اٹل رہنا معاملے کی نوعیت پر منحصر ہوتا۔ بادشاہ مجبور تھا کہ جا اور بے جا مداخلت کو خاموشی سے برداشت کرے اور شاہان اودھ نے اپنے اسی روایتی اطاعت کی بدولت اپنی سلطنت کو ہر طرح کی قربانیاں پیش کر کے باقی رکھا۔ لارڈ ڈلہوزی کی سامراجیت کے زمانے میں جب ویسی ریاستیں طرح طرح کے حیلہ بہانوں سے منطقی جا رہی تھیں، انگریزوں کو کسی قربانی کی نہیں خود سلطنت کی ضرورت تھی۔ انتزاع سلطنت کا واقعہ بادشاہ اور رعایا دونوں کی قسمت میں ایک عظیم انقلاب کا پیش خیمہ تھا لیکن بے بسی اور اطاعت کے مظاہرے میں یہ واقعہ بھی کسی گزشتہ کارروائی سے کم نہ تھا۔ فرق تھا تو صرف یہ کہ بادشاہ اور سلطنت کے خیر خواہ افراد نے اگر مزاحمت نہ کی تو اس فیصلے کو قبول بھی نہ کیا۔ مزاحمت نہ کرنے میں ان کی مصلحت دلی والوں کے مثل تھی لیکن اسے قبول نہ کرنا دلالت کرتا ہے کہ عیش پسندی کے باوجود اودھ کے باشندوں میں یہ خواہش بہر طور موجود تھی کہ انہیں اپنی سلطنت عزیز ہے، اسے باقی رہنا چاہئے۔ مغلیہ سلطنت کی حدیں جو انگریزوں کی عنایت سے پہلے بحیرہ عرب اور خلیج بنگال کو چھو رہی تھیں، سمٹنے سمٹنے لال قلعہ کی دیواروں سے جا لگیں اور سلطنت کے خیر خواہ اس

پر بھی راضی تھے کہ کچھ ہو اس تخت کو باقی رکھا جائے۔ اودھ کی حدیں انگریزوں کی سرپرستی سے پہلے لنگا اور جتنا کو آغوش میں لئے تھیں لیکن اسی غیر ملکی حکومت کے اثر گھا گھرا اور گومتی تک سمٹ آئیں اور واجد علی شاہ اگر چاہتے تو قیصر باغ کی چہادد یواری میں اودھ کی سلطنت محدود ہو جاتی لیکن اس فیصلے کو نہ انہوں نے قبول کیا اور نہ ان کی رعایا نے۔

سرکشی اور لکھنویت کا خاتمہ

انتزاع سلطنت کا اندیشہ انتزاع سلطنت سے بہت قبل پیدا ہو چکا تھا۔ اگست ۱۸۵۵ء میں اودھ کے کوئی دوسو سربراہ اور افراد نے ایک خفیہ میٹنگ میں طے کیا کہ انتزاع سلطنت کو روکنے کے لئے ڈیڑھ لاکھ پونڈ سالانہ لالچی کارندوں کا منہ بھرنے اور تحریک چلانے پر صرف کیا جائے۔ ان کا متفقہ فیصلہ تھا، فرنگیوں کو سونا عزیز ہے، اودھ کے باشندوں کو اپنی آزادی اس سے زیادہ عزیز ہے۔ اس فیصلے کی تعمیل میں انہوں نے خفیہ پمفلٹ شائع کئے اور اپنے مقصد کی تکمیل میں لگ گئے۔ واجد علی شاہ نے ایسے لوگوں کی حمایت نہیں کی لیکن ان کا کام اس کے بغیر بھی جاری رہا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں پوشیدہ تحریکیں منظر عام پر آ گئیں۔ لکھنؤ ریزیڈنسی کی عمارت ان کے عتاب میں تباہ ہو گئی۔ راوی کا بیان ہے کہ مجاہدین آزادی کی آرزو تو یہ تھی کہ وہ اسے کھود کے تالاب بنائیں گے لیکن ان کی آرزو پوری ہونے کے بجائے وہ بات سامنے آ گئی جس نے واجد علی شاہ کو خاموشی سے سب زیادتیاں برداشت کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ آدھے سے زیادہ لکھنؤ کھد گیا۔ قدیم خاندان تباہ ہو گئے۔ شعر و ادب کی قدریں بدل گئیں اور جو انقلاب رفتہ رفتہ ظاہر ہونا، اپنے سیلاب میں تیزی سے اس تہذیب کو بہا لے گیا جسے مشرقی تمدن کا آخری نمونہ کہا گیا ہے۔

□□□

میری ماں کہیں



کرشنا سوہتی
گوگل نگر، کشمیر ایونیو
امر تسر (پنجاب)

آنکھیں خون مارنے لگیں۔ اچانک جیسے ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر جڑ گیا ہے۔ ٹرک پھر چل پڑا ہے۔ تیز رفتار سے۔ ٹرک کے کنارے کنارے موت کی آغوش میں سٹے ہوئے گاؤں، لہلہاتے کھیتوں کے آس پاس لاشوں کے انبار کبھی کبھی دور سے آتی ہوئی اللہ اکبر اور ہر مہادیو کی صدائیں۔ ہائے ہائے؛ پکڑو پکڑو؛ مارو مارو یونس خاں یہ سب سن رہا ہے۔ بالکل چپ چاپ۔ اس سے کوئی سروکار نہیں اسے۔ وہ تو دیکھ رہا ہے، اپنی آنکھوں سے ایک نئی مغلیہ سلطنت۔ شاندار، پہلے سے کہیں زیادہ بلند۔ چاند نیچے اترتا جا رہا ہے۔ دودھ سی چاندنی نیلی پڑ گئی ہے۔ شاید دھرتی کا خون اوپر زہر بن کر پھیل گیا ہے۔ دیکھو، ذرا ٹھہرو، یونس خاں کا ہاتھ بریک پر ہے۔ یہ، یہ کیا؟ ایک ننھا سا، چھوٹا سا سیاہ، سیاہ؟ نہیں، خون سے تر شلوار میں بیہوش بڑی ایک بچی!

بلوچ نیچے اترتا ہے۔ زخمی ہے شاید! مگر وہ رکا کیوں؟ لاشوں کے لئے کب رکا ہے وہ؟ لیکن یہ ایک زخمی لڑکی۔ اس سے کیا؟ اس نے ڈھیروں کے ڈھیروں دیکھے ہیں، عورتوں کے مگر نہیں، وہ اسے ضرور اٹھالے گا۔ اگر سچ سکی تو، تو، وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ یونس خاں خود نہیں سمجھ پا رہا لیکن اب اسے وہ نہ چھوڑ سکے گا۔ کافر ہے تو کیا؟

بڑے بڑے مضبوط ہاتھوں میں بیہوش لڑکی۔ یونس خاں اسے ایک سیٹ پر لٹاتا ہے۔ بچی کی آنکھیں بند ہیں۔ سر کے کالے گھنے بال شاید نم ہیں، خون سے، اور چہرے پر؟ زرد چہرے پر، خون کی چھینٹیں۔

یونس خاں کی انگلیاں بچی کے بالوں میں ہیں

اس سال کا گیان پیٹھ ایوارڈ ہندی کی بزرگ ادیبہ محترمہ کرشنا سوہتی کو دینے کا اعلان کیا گیا۔ بے خوف، بے لوث اور تمام مکروہات زمانہ سے بے پروا کرشنا سوہتی ہندی ادب کی بجز محترم شخصیت ہیں۔ اسی لئے جب انہیں یہ ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا تو اکثر لوگوں نے کہا کہ انہیں ایوارڈ دے کر گیان پیٹھ نے خود اپنی عظمت میں اضافہ کیا ہے۔ اردو ادب میں ۱۹۶۹ء میں فراق گورکھپوری اور ۱۹۸۹ء میں قرۃ العین حیدر گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازی جا چکی ہیں۔ ۱۸ فروری ۱۹۲۵ء کو گجرات (پاکستان) میں پیدا ہوئیں کرشنا سوہتی کو ۲۰۱۰ء میں پدم بھوشن سے نوازنے کا اعلان کیا گیا تو انہوں نے یہ کہہ کر یہ اعزاز لینے سے منع کر دیا کہ ایک ادیب کے طور پر مجھے اقتدار سے دوری بنا کر رکھنی چاہئے۔ اس سے پہلے ۱۹۸۰ء میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ مل چکا ہے۔ ۱۹۹۶ء میں انہیں ساہتیہ اکادمی فیوشپ ملی۔ منتر و جانی سے ان کی شہرت کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ جاری ہے۔ زندگی نامہ، اے لڑکی، ڈار سے بچھڑے، ہم حشمت، یاروں کے یار، تین پہاڑ، سمئے سرگم، سورج مکھی امدھیرے کے، بادلوں کے گھیرے، سکہ بدل گیا، دادی اماں، جانے کا درد ہے جلدی ان کی درجنوں تصنیفات شائع ہو چکی ہیں۔ اردو زبان میں 'دل و دانش' کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ 'بادلوں کے گھیرے' ان کی ابتدائی دور کی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ پیش ہے اس مجموعہ کی تین کہانیاں جس کا اردو ترجمہ نجیب انصاری نے کیا ہے جو قارئین یاد رکھیں بطور خاص پیش کی جا رہی ہیں۔ (ایڈیٹر)

بلوچ ریجنٹ کے بہادر یونس خاں نے جب آسمان کی جانب دیکھا تو چاند آدھی منزل طے کر چکا تھا۔ آج چار دن کے بعد اس نے چاند ستارے دیکھے ہیں۔ اب تک وہ کہاں تھا جہاں اس کے ہاتھ کی صفائی بے شمار گولیوں کی بوچھاریں کر رہی تھی۔ لیکن، لیکن وہ نیچے نہ تھا۔ وہ تو اپنے نئے وطن کی آزادی کے لئے لڑ رہا تھا۔ وطن کے آگے کوئی سوال نہیں، اپنا کوئی خیال نہیں! تو چار دن سے وہ کہاں تھا؟ کہاں نہیں تھا وہ؟ گوجرانوالا، وزیر آباد، لاہور! وہ اور میلوں چیرتا ہوا ٹرک۔ کتنا گھوما ہے وہ؟ یہ سب کس کے لئے؟ وطن کے لئے قوم کے لئے اور؟ اور اپنے لئے! نہیں، اسے اپنے سے اتنی محبت نہیں! کیا لمبی سڑک پر کھڑے کھڑے یونس خاں دور دور گاؤں میں آگ کی لپٹیں دیکھ رہا ہے؟ چیخوں کی آواز اس کے لئے نئی نہیں۔ آگ لگنے پر چلانے نے میں کوئی نیا بن نہیں۔ اس نے آگ دیکھی ہے۔ آگ میں جلتے بچے دیکھے ہیں، عورتیں اور مرد دیکھے ہیں۔ رات رات بھر جل صبح خاک ہو گئے مٹوں میں جلے لوتھڑے دیکھے ہیں! وہ دیکھ کر گھبراتا تھوڑے ہی ہے؟ گھبرائے کیوں؟ آزادی بنا خون کے نہیں ملتی، انقلاب بنا خون کے نہیں آتا اور، اور، اسی انقلاب سے تو اس کا ننھا سا ملک پیدا ہوا ہے! ٹھیک ہے۔ رات دن سب ایک ہو گئے۔ اس کی آنکھوں میں نیند ہے، لیکن اسے تو لاہور پہنچنا ہے۔ بالکل صحیح موقع پر۔ ایک بھی کافر زندہ نہ رہنے پائے۔ اس ہلکی ہلکی سرو رات میں بھی 'کافر' کی بات سوچ کر بلوچ جوان کی

اور بالوں کا خون اس کے ہاتھوں میں، شاید سہلانے کی کوشش میں! لیکن نہیں، یونس خاں اتنا جذباتی کبھی نہیں تھا۔ اتنا رجم، اتنی ہمدردی اس کے ہاتھوں میں کہاں سے اتر آئی ہے؟ وہ خود نہیں جانتا۔ بیہوش پگی ہی کیا جانتی ہے کہ جن ہاتھوں نے اس کے بھائی کو مار کر اس پر حملہ کیا تھا، انہیں کے ہم مذہب ہاتھ اسے سہلارہے ہیں!

یونس خاں کے ہاتھوں میں پگی اور اس کی پڑتشد آکھیں نہیں، اس کی نم آنکھیں دیکھتی ہیں، دور کونٹے میں۔ ایک سرد، بالکل سرد شام میں اس کے ہاتھوں میں بارہ سال کی خوبصورت بہن نورن کا جسم، جسے چھوڑ کر اس کی بیوہ امی نے آنکھیں موند لی تھیں۔

سنسناتی ہوا میں، قبرستان میں اس کی پھول سی بہن موت کے دامن میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دنیا سے بے خبر اور اس پرانی یاد میں کانپتے ہوئے یونس خاں کے دل و دماغ۔ آج اسی طرح، بالکل اسی طرح، اس کے ہاتھوں میں، مگر کہاں ہے وہ، یونس خاں جو قتل عام کو دین اور ایمان سمجھ کر چار دن سے خون کی ہولی کھیلتا رہا ہے۔ کہاں ہے؟ کہاں ہے؟

یونس خاں محسوس کر رہا ہے کہ وہ بل رہا ہے، متزلزل ہورہا ہے۔ وہ کب تک سوچتا رہے گا۔ اسے چلنا چاہئے، پگی کے زخم! اور پھر، ایک بار پھر تھپتھپا کر، ادب سے، ہیگی ہیگی متنا سے پگی کو لٹا کر یونس خاں فوجی کا ٹرک تیزی سے اسٹارٹ کرتا ہے۔ اچانک سمجھ میں آ جانے والے فرض کی پکار میں، اسے پہلے چل دینا چاہئے تھا۔ ہو سکتا ہے یہ پگی بچ جائے۔ اس کے زخموں کی مرہم پیٹی، تیز، تیز اور تیز۔ ٹرک بھاگا جا رہا ہے۔ دماغ سوچ رہا ہے۔ یہ کیا ہے؟ اسی ایک کے لئے کیوں؟ ہزاروں مرچکے ہیں، یہ تو لینے کا دینا ہے۔ وطن کی لڑائی جو ہے! دل کی آواز ہے، چپ رہو، ان معصوم بچوں کی ان قربانیوں کا آزادی کے خون سے کیا تعلق؟ اور تھی پگی، بیہوش، بے خبر۔

لاہور آنے والا ہے۔ یہ ٹرک کے ساتھ ساتھ بچھی ہوئی ریل کی پٹریاں۔ شاہدہ۔ اور اب ٹرک

لاہور کی سڑکوں پر ہے۔ کہاں لے جائے گا وہ؟ مے یو اسپتال یا سرنگارام؟ لنگارام کیوں؟ یونس خاں چونکتا ہے۔ وہ کیا اسے لوانا جا رہا ہے؟ نہیں، نہیں، اسے اپنے پاس رکھے گا۔ ٹرک مے یو اسپتال کے سامنے جا رکتا ہے اور چند لمحوں کے بعد بلوچ فکرمند آواز میں ڈاکٹر سے کہہ رہا ہے، ڈاکٹر، جیسے بھی ہو، ٹھیک کر دو، اسے صحیح سلامت چاہتا ہوں میں! اور پھر جوش میں، 'ڈاکٹر، ڈاکٹر اس کی آواز قابو میں نہیں رہتی ہے۔'

ہاں ہاں، پوری کوشش کریں گے اسے ٹھیک کرنے کی۔ پگی اسپتال میں پڑی ہے۔ یونس خاں اپنی ڈیوٹی پر ہے مگر کچھ بے من سے، حیران، فکرمند، ڈیوٹی انجام دے رہا ہے۔

لاہور کی بڑی بڑی سڑکوں پر کہیں کہیں رات کی لگی ہوئی آگ سے دھواں نکل رہا ہے۔ کبھی کبھی ڈرے ہوئے، سہمے ہوئے لوگوں کی ٹولیاں کچھ فوجیوں کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ کہیں اس کے اپنے ساتھی شہدوں کی ٹولیاں کی طرف اشارہ کر کے ہنس رہے ہیں۔ کہیں کوزا کرکٹ کی طرح آدمیوں کی لاشیں پڑی ہیں، کہیں اجاڑ پڑی سڑکوں پر تنگی عورتیں، بیچ بیچ میں نعرے، نعرے، اور اونچے اور یونس خاں جس کے ہاتھ کل تک خوب چل رہے تھے، آج منجمد ہیں۔ شام کو لوٹتے ہوئے جلدی جلدی قدم بھرتا ہے۔ وہ اسپتال نہیں، جیسے گھر جا رہا ہے۔ ایک اجنبی پگی کے لئے کیوں گھبراہٹ ہے اسے؟ وہ لڑکی مسلمان نہیں، ہندو ہے، ہندو ہے! دروازے سے پلنگ تک جانا اسے دور، بہت دور جانا لگ رہا ہے۔ لمبے لمبے قدم۔

لوہے کے پلنگ پر پگی لیٹی ہے۔ سفید بیٹیوں سے بندھا سر، کسی بھیانک منظر کے تصور سے آنکھیں اب بھی بند ہیں۔ خوبصورت سے بھولے چہرے پر ڈر کا خوفناک سایہ۔ یونس خاں کیسے بلائے، کیا کہے؟ 'نورن نام ہونٹوں پر آ کے رکتا ہے۔ ہاتھ آگے بڑھتے ہیں۔ چھوٹے سے زخمی سر کا لمس، جس نرمی سے اس کی

انگلیاں چھو رہی ہیں، اتنی ہی بھاری آواز اس کے گلے میں رک گئی ہے۔

اچانک بچی حرکت کرتی ہے۔ مغموم آواز میں، جیسے بیہوشی میں بڑبڑاتی ہو۔

'کیپ، کیپ، کیپ آگیا۔ بھاگو، بھاگو، جلدی کچھ نہیں، کچھ نہیں، دیکھو، آنکھیں کھولو۔'

'آگ، آگ، وہ گولی، ملٹری'

بچی اسے پاس جھکے دیکھتی ہے اور چیخ مارتی ہے۔ 'ڈاکٹر، ڈاکٹر، ڈاکٹر اسے اچھا کر دو۔'

ڈاکٹر تجربہ کار آنکھوں سے دیکھ کر کہتا ہے، 'تم سے ڈرتی ہے۔ یہ کافر ہے، اسی لئے۔'

'کافر، یونس خاں کے کان جھنجھنا رہے ہیں، کافر، کافر، کیوں، پچایا جائے اسے؟ کافر؟ کچھ نہیں، میں اسے اپنے پاس رکھوں گا!'

اسی طرح گزر گئیں وہ خونیں راتیں۔ یونس خاں بے چین سا اپنی ڈیوٹی پر اور پگی اسپتال میں۔

ایک دن۔ پگی اچھی ہونے کو آئی۔ یونس خاں آج اسے لے جائے گا۔ ڈیوٹی سے واپس آنے کے بعد وہ اس وارڈ میں آکھڑا ہوا۔ پگی بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ڈر ہے، نفرت ہے اور، اور، شب۔

یونس خاں پگی کا سر سہلاتا ہے۔ پگی کانپ جاتی ہے! اسے لگتا ہے کہ یہ ہاتھ گلا دبوچ لیں گے۔ پگی سہم کر پکلیں موند لیتی ہے! کچھ سمجھ نہیں پاتی۔ کہاں ہے وہ؟ اور یہ بلوچی؟ وہ بھیا نک رات! اور اس کا بھائی! ایک جھٹکے سے اسے یاد آتا ہے کہ بھائی کی گردن گنڈا سے دور جا پڑی تھی۔

یونس خاں دیکھتا ہے اور دھیمے سے کہتا ہے، 'اچھی ہونا! اب گھر چلیں گے۔'

بچی کانپ کر سر ہلاتی ہے، 'نہیں، نہیں، گھر، گھر کہاں ہے! مجھے تم مار ڈالو گے۔'

یونس خاں دیکھنا چاہتا تھا نورن۔ لیکن یہ نورن

سے ایک بار شمو جان کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر اس کے گلے کے نیچے لگے سونے کے پٹنوں پر اپنی نظر ٹھہرا دی۔

شمو جان نے اس تلکلی کو سمجھتے ہوئے بھی اسے نظر انداز کر کے کہا، 'ڈرا جلدی کرنا بھورے، پھر لوگ آجائیں گے۔'

بھورے نے بادل ناخواستہ جھنڈیاں لگانا شروع کیں۔ باریک باریک پتنگ کے کاغذوں کی سی آواز شمو جان اندر بیٹھی سن رہی ہے۔ اس کے پیلے ہو چکے دانت سپاری چبائے جارہے ہیں۔ سانسے والے کمرے سے منی جان نکل کر آئی اور بولی، 'کہو بہن، کیا ہو رہا ہے، آج تو پورا بازار سجا ہے۔'

'ہاں منی، آج تو شہر بھر میں روشنی ہے...'

بیچ میں ہی بات کاٹتے ہوئے منی جان نے اپنی کرخت اور بیچٹی سی آواز میں کہا، 'لیکن یہ کیوں ہو رہا ہے، کیوں ہو رہا ہے؟' اور یہ سوال کرتے ہوئے اپنا باریک دوپٹہ میلے سے گاؤ تکتے پر پھینک کر منی جان چارپائی پر لڑھک گئی۔ اس کے تلوؤں پر بدرنگ سی مہندی لگی تھی۔

شمو جان نے کہا، 'آج آزادی کا دن ہے منی۔' 'دن نہیں، رات کہو، رات! منی نے ایسے چیخ کر کہا، جیسے کہیں پڑی ہوئی دراروں سے پھوٹ کر اس کی آواز باہر نکل آنا چاہتی ہو اور وہ اپنے پیڑی جئے ہونٹوں کو پھیلا کر بنس پڑی۔

شمو جان نے ہمدردی بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا، 'منی، کہتے ہیں، آج لوگوں کو آزادی مل رہی ہے، جلوس نکل رہے ہیں، جلسے ہو رہے ہیں۔'

منی نے اپنی کسی اور تنگ قمیص میں سے ڈرا لمبی سانس لے کر کہا، 'کیا کہا، آزادی؟ لوگوں کو آج مل رہی ہے آزادی! آزادی تو ہمارے پاس ہے۔ ہم سا آزاد کون ہوگا، شمو جان؟' اور باہا تہتہ لگا کر گلابی رنگ سے

کروڑوں کروڑ لوگ جوش میں جھومتے ہوئے قومی شاہراہ پر بکھر گئے۔ گھر باہر سے، بازار سے اور سج گئیں روپ کی وہ دکانیں، جہاں روپ روز روز استعمال ہو کر باسی اور بے رونق ہو جاتا ہے۔

شمو بی نے اپنی خشک سی کلائی میں پڑی پیتل اور کانچ کی چوڑیوں کو جھکار کر کے سستی میں انگریزی بی۔ سستی سی ریشمی شلووار پر گہرے گلابی رنگ کی قمیص اور قمیص میں لپٹا ہوا تھکا ماندہ جسم اور جسم کے وزن سے اکڑی ہوئی ایک عورت کی ہڈیاں جیسے چرمرا اٹھیں۔ دروازے پر لگی رنگ برنگی موتیوں کی جھالار کوٹھوں پر سے آتی ہوئی پھینکی ہوا سے ڈراماں لگا کر خاموش ہو گئی۔ کونے میں پڑی میز پر نیلے سے گلدان میں کئی دنوں کے مرجھائے پھول سلوٹوں سے پڑھیلے بستر کو دیکھ کر تامل میں ڈوب گئے۔ مگر شمو بی کے لئے یہ سب کچھ نیا نہیں۔ تامل میں ڈوبے ہوئے پھولوں پر اس کی نظر نہیں جاتی۔ ان سے کہیں زیادہ وہ خود اس گہرائی میں ڈوبی ہے جہاں تامل بے معنی ہو جاتا ہے۔ برسوں پرانے اس پاندان میں سے پان لگا کر چباتے چباتے اسے یہ سوچنے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ پان کا رس چوس لینے پر پیکدان میں تھوکنے کی عادت کیوں بے مطلب نہیں؟

اور آج شمو بی بی جانتی ہے کہ آزادی کا دن ہے۔ جن کوٹھوں پر بیٹھ کر وہ راگیروں کو مدعو کیا کرتی ہے، انہیں پر آج ترنگی جھنڈیاں لگانی جائیں گی۔

'بھورے، بھورے... اس نے آواز لگائی۔ شمو جان کی سیزھیوں پر بیٹھا بھورا کسی نوجوان چھوکرے کو ہاتھ کے اشارے سے شمو کے جسم کی ناپ بتلاتے ہوئے اوپر آپہنچا اور بولا، 'ہاں، ہائی، آج جھنڈیاں لگیں گی نا؟'

'روشنی بھی کرنی ہے بھورے'

'ضرور ہائی، لیلو، چچا، بنو سب کے کوٹھے سچ چکے ہیں۔ اور بھورے نے اپنی سرما لگی تنیکھی آنکھوں

نہیں کوئی انجان ہے جو اسے دیکھتے ہی خوف سے سمٹ جاتی ہے۔

بیچی سہی سی رُک رُک کر کہتی ہے، 'گھر نہیں، مجھے کیپ میں بھیج دو۔ یہاں مجھے مار دیں گے۔ مجھے مار دیں گے۔' یونس خاں کی پلکیں جھک جاتی ہیں۔ ان کے نیچے فوجی کی بے رحمی نہیں، زور نہیں، اختیار نہیں۔ ان کے نیچے ہے ایک بے یار و مددگار جذبہ، ایک بے بسی، بے اختیاری۔ بلوچ ہمدردی سے بیچی کو دیکھتا ہے۔ کون بچا ہوگا اس کا؟ وہ اسے اپنے پاس رکھے گا۔ بلوچ کسی انجان محبت میں شرابور ہوتا جا رہا ہے۔ بیچی کو ایک بار مسکراتے ہوئے تھپتھپاتا ہے۔ 'چلو چلو، کوئی فکر نہیں۔ ہم تمہارا اپنا ہے۔'

ٹرک میں یونس خاں کے ساتھ بیٹھ کر بیچی سوچتی ہے۔ بلوچی کہیں اکیلے ہی جا کر اسے ضرور مار دے گا۔ گولی سے، چھڑے سے۔ بیچی بلوچی کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے، 'خان، مجھے مت مارنا، اس کا سفیدی ماٹل چہرہ بنا رہا ہے کہ وہ ڈر رہی ہے۔'

خان بیچی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے، 'نہیں، نہیں، کوئی ڈر نہیں۔ کوئی ڈر نہیں، تم ہمارا۔ گاکے مالک ہے۔' ایک بیک لڑکی پہلے خان کا منہ نوچنے لگتی ہے پھر رورور کر کہتی ہے، 'مجھے کیپ میں چھوڑ دو۔ چھوڑ دو مجھے۔'

خان نے ہمدردی سے سمجھایا، 'صبر کرو، روڈو نہیں۔ تم ہمارا بچہ بن کر رہے گا، ہمارے پاس 'نہیں۔ لڑکی خان کی چھاتی پر مھصیاں مارنے لگی، 'تم مسلمان ہو، تم'

یکبارگی لڑکی نفرت سے چیختے لگی، 'میری ماں کہاں ہے! میرے بھائی کہاں ہیں! میری بہن کہاں!'

آزادی شمو جان کی

ترنگوں کے سائے میں شہر و سنا شہر مسکرا اٹھا۔ چراغوں کی قطاروں سے خاموش آنکھوں کی تاریک فضیلیں بھی جگمگا اٹھیں۔ آج آزادی کا تہوار تھا۔

لپا پتا نسوانی جسم لٹھے کی میلی چادر پر دراز ہو گیا۔ شمو جان کب تک وہاں بیٹھی رہی، مٹی کو کوئی خبر نہیں۔ بے خبر سوئی پڑی مٹی کے انگ انگ کی تھکان کو شمو سمجھ رہی تھی۔ اپنے اندر پڑے پردوں کو ہٹا کر اگر وہ بھی دیکھے، تو ایک شکنہ اور مجروح سایہ اس کی بے نیند آنکھوں میں جھلک جائے گا۔

برسوں گزر گئے جب شمو جان شرم و حیا چھوڑ کر پہلی بار ان دیواروں کے اندر بیٹھ کر مسکرا دی تھی کہ اب وہ آزاد ہے۔ جس آزادی کو ابھی ابھی مٹی نے اپنی بے نری آواز میں یاد کیا تھا، وہ آج کتنی بد بیئت اور کتنی بد شکل ہو چکی ہے، یہ آج اسے بھولا نہیں۔

رات کافی ہو چکی۔ باہر روشنی زیادہ ہے لیکن بازار میں مندی ہے۔ گاہک بڑی بڑی عمارتوں پر لگی روشنی دیکھنے میں مصروف ہیں۔ کتنی ہی بایاں ترنگوں سے سچے اپنے کٹھوں پر کھڑی کھڑی ان باہوں کا انتظار کر رہی ہیں، جو زیادہ نہیں، تو آج کی رات تو انہیں باندھ سکیں۔ وہ جانتی ہیں کہ روز روز کا ٹوٹنا، جڑنا اور چھوٹنا... برسوں سے بس ایک ہی سلسلہ! اگر کسی دن اس میں وقفہ آ گیا تو ساکت ہو گئے ہاتھ پیروں میں دھیمے دھیمے بہتا خون یکبارگی جم جائے گا۔

شمو جان دیکھتی ہے کہ مٹی آج جس آزادی کی بات سوچ کر گہری نیند میں سو گئی ہے، اس سے اٹھ کر کیا وہ پھر اپنی میلی آنکھوں کو کجرا کرے گی؟ کیا وہ اپنے بالوں کو موتیوں سے سنوار کر جھجے پر جا کھڑی ہوگی؟ شمو کو مٹی کے لئے اس میں شک ہے، اپنے لئے نہیں، وہ تو ابھی جاگ رہی ہے، سوئی نہیں ہے۔ وہ جو کچھ ہے، اپنے آپ سے بھولی ہوئی نہیں ہے لیکن بھولنا کیا، اسے تو یاد کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسے ابھی زندگی کا ٹی ہے، خود کو پہچان نہیں، خریدنا ہے، ایسے داموں پر جنہیں وہ کیا، اس کے خاندان کے وہ سب دیوی دیوتا بھی نہ ادا کر پائیں گے۔ جن کی دہلیز پر اس نے نہیں تو اس کے اجداد نے ناک رگڑ کر وہ

وردان حاصل کیا ہوگا۔ مگر وہ سب کچھ کیوں دہرائے؟ مٹی جان کو اسی بیہوشی میں چھوڑ کر شمو جان کو لٹھے پر آکھڑی ہوئی۔ اسی وقت بھورے نے اپنی غلیظ آواز میں کہا، بائی چلو، آج اچھی چیز لایا ہوں۔

ایک لمبی ہونے کے بعد پل بھر رک کر شمو نے ایک بار ٹھہری سی نظر سے آزادی کے چراغوں کو دیکھا، ہوا میں کھڑ کھڑاتی ان جھنڈیوں کو دیکھا اور پھر اپنے سدھے سدھائے قدم اٹھا کر کمرے کی طرف چل پڑی۔

باہر جھنڈے ہوا میں لہرا رہے تھے، چراغ ہلکے ہلکے جل رہے تھے، لوگ آزادی سے گلے مل رہے تھے اور اندر شمو جان اپنی پرانی آزادی بانٹ رہی تھی جو شاید اس کے پاس ابھی بھی بہت تھی... بہت تھی۔

ڈرومت، میں تمہاری حفاظت کروں گا

اُس طوفانی سی رات میں جب آسمان نعروں سے گونج رہا تھا، دو بازوؤں نے کسی خوبصورت، معصوم جسم کو تھام کر یقین دلا یا تھا، ڈرومت، میں تمہاری حفاظت کروں گا۔

بازو بازو سے ملے اور خوف سے سکڑی ہوئی دو آنکھیں مسکرا دیں۔ آنکھوں سے آنکھیں ملیں اور دھرتی کے آنچل پر شبنم ٹپک گئی۔

آسمان کے موتی دھرتی پر پھول بن کر کھل گئے اور ایک دن... مارو مارو، کالو، اللہ اکبر، ہر ہر مہادیو! بہار کے گلشن کو روندتے ہوئے وہ ہزاروں قدم، خون میں تیرتی ہوئی وہ آنکھیں اور ہتھیاروں کو تو لٹے ہوئے وہ ہاتھ.....!

اس بند مکان میں، سانس روکے ہوئے دو انسان ڈولتے ڈالتے، ڈوبتے ڈوبتے، زندگی اور موت کی کشمکش میں۔

مارو مارو کی آوازیں قریب آ رہی ہیں۔ اور قریب، اور قریب۔ ہلکی سی چیخ نکلی اور دو مضبوط

بازوؤں نے اس بے جان سے جسم کو تھام کر دھیمے سے کہا، ڈرومت، میں تمہاری حفاظت کروں گا۔ اچانک دروازے پر ہزاروں کی بھیڑ، دروازے ٹوٹ گئے۔ مارو مارو، جلا دو اور پلک جھپکتے ہاتھوں سے ہاتھ چھوٹ گئے۔ پرانے وعدے ٹوٹ گئے۔

میں اس کی حفاظت کروں گا، میں... آواز کھڑ گئی۔ کسی نے گلابا کر سردیوار کے ساتھ دے پٹکا اور معصوم بازو اپنی طرف کھینچ لئے۔

سر گھوما، آنکھیں گھومیں، زمین گھومی، آسمان گھوما... اور اس چکر میں دیکھا۔ وہ ننھا سا شیریں جسم خونخواروں کے ہاتھوں میں! ہائے... ایک دھار چمکی اور سونے سے بھرے سنہرے بازو کٹ کر نیچے گر پڑے۔ ڈرومت، میں تمہاری حفاظت کروں گا۔

ایک سنسان دو پہر میں کیمپ کے سامنے کچھ لاریاں آکھڑی ہوئیں۔

بچے، بوڑھے، زخمی اتر رہے ہیں۔ بھوک اور پیاس سے بے حال، گرتے پڑتے، لیکن اس بیچھلی سیٹ پر...؟ ایک بیجان نوجوان... پتھرائی آنکھیں، خشک بال اور نیلے ہونٹ... ڈرائیور نے ہمدردی کے نم لہجے میں اس بیجان جسم کو جنبش دے کر کہا، اٹھو بھائی، اپنا وطن آ گیا... وطن! ہونٹ پھڑ پھڑائے۔ دو سونے ہوئے بھرے ہوئے بازو اٹھے، ہونٹ پھڑ پھڑائے، ڈرومت، میں تمہاری حفاظت کروں گا۔ آواز موت کی خاموشی میں کھو گئی۔ پتھرائی ہوئی آنکھوں کی پلکیں منجمد ہو گئیں۔

وطن کا سفر ختم ہو گیا اور حفاظت کرنے والے بازو ہمیشہ کے لئے ساکت ہو گئے۔ ڈرائیور نے سرد ہاتھوں سے اٹھا کر بچھے ہوئے جسم کو زمین پر لٹا دیا۔ مٹی مٹی سے مل گئی۔ لیکن سنو، مٹی سے ایک دھیمی سی آواز اٹھ رہی ہے۔

ڈرومت، میں تمہاری حفاظت کروں گا۔ میں... □□□

ایس دن



حمید دلوانی

۱۹۷۷ ۱۹۳۲

رہے تھے۔ ہر بار اؤ بھی آیا ہوا تھا۔ بابا نے اشتیاق سے پوچھا، 'کیا ہوا؟'
'وہ ماننے کو تیار نہیں۔'
'مجھے معلوم تھا۔'
'اب کیا کریں؟' ہر بار اؤ نے پوچھا۔
'کیا کر سکتے ہیں؟' میں نے کہا۔ 'آپ لوگ اپنی بات چیت جاری رکھے، اس سے کوئی راستہ نکلے گا۔'

بابا نے کندھے اچکائے۔ ان کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ انہیں اس کی بھی امید نہیں ہے۔
اس رات میں سمٹی کے گھر گیا۔ وہ مجھ سے بہت دنوں سے نہیں ملی تھی۔ کہیں دکھائی بھی نہیں دی تھی۔
میں پہنچا تو وہ باہر کا دروازہ بند کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر حیران ہو گئی۔ ہمیشہ کی طرح وہ مجھے اپنے رسوئی گھر میں لے گئی۔

'میں سمجھا تم بھینٹی چلی گئی ہو، میں نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔
'اگر جاتی تو تمہیں بتا کر جاتی۔ لیکن جانے کا سوچ رہی ہوں۔'
'کیوں؟ تمہارے بھائی نے پھر چٹھی لکھی ہے؟'

'چٹھیاں تو ہمیشہ ہی آتی رہتی ہیں۔ میں ہی اب تک ان پر دھیان نہیں دیتی تھی۔ تم کب جا رہے ہو؟ ساتھ چلتے ہیں۔'

'میرے جانے کا کچھ ٹھیک نہیں۔ گاؤں میں

حمید عمر دلوانی مراٹھی زبان کے مقبول ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے مراٹھی زبان میں کئی ناول لکھے۔ مراٹھی کے علاوہ ان کی انگریزی میں بھی کچھ کتابوں شائع ہو چکی ہیں۔ مراٹھی اور انگریزی زبان پر انہیں یکساں مہارت حاصل تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے تہذیبی اور سماجی مسائل پر مبنی ان کی کئی کتابیں مراٹھی زبان میں شائع ہو چکی ہیں۔ انہوں نے بحیثیت صحافی اپنے کیریئر کی شروعات کی تھی۔ وہ سیاست میں بھی سرگرم رہے۔ انڈین سوشلسٹ پارٹی کے نمایاں لیڈر کے طور پر بھی انہوں نے اپنی شناخت قائم کی۔ اپنی محض ۴۴ سالہ زندگی کا کافی بڑا عرصہ انہوں نے مسلم طبقہ بالخصوص مسلم عورتوں کی تعلیمی پیمانہ نگاری کو دور کرنے میں صرف کیا۔

اردو کے ادبی رسالوں میں عام طور پر روسی، انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں کی تصنیفات نظر آ جاتی ہیں لیکن اردو ہندی کے علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب کے تراجم شائع کرنے کا رواج ذرا کم ہے۔ ہماری کوشش رہے گی کہ نیا دور کے ہر شمارے میں ہندوستانی زبانوں کے نمائندہ ادب پاروں کے ترجمے پیش کئے جائیں۔ اسی سلسلہ کی ساتویں کڑی کے طور پر مراٹھی زبان کے مشہور ادیب حمید دلوانی کے ناول 'ایس دن' کی ساتویں قسط شائع کی جا رہی ہے۔

(ایڈیٹر)

'بڑھنے دو! ہم دیکھ لیں گے۔ سمجھے؟ تم کیوں ان کی دلانی کر رہے ہو؟ تم نے زندگی بھر یہی کیا اور ہمیں برباد کر ڈالا۔ کیا اب بھی کچھ کسرتی ہے؟ ہماری کھیتیاں چھنوا دیں۔ ان کلوڑیوں کو سر پر چڑھا دیا۔ لیکن وہ تمہیں پرالٹ پڑے، اس پر بھی تم انہیں کی طرف داری کرو گے؟'

'میں نے ٹھیک کیا۔ یہ ان کا حق تھا۔ اگر میں نہ ہوتا تو وہ کسی اور کے پاس صلاح لینے چلے جاتے۔ دب کے رہنے والے تو تھے نہیں۔ ارے زمانہ بدل گیا ہے۔ اس میں تم یا میں کیا کر سکتے ہیں؟'

اسحق غصے سے کھول اٹھا۔ زمانہ بدلنے کی بات مت کرنا۔ زمانہ بدلنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمارے گھر میں گھس آئیں۔ زمانہ بدل گیا ہو، تب بھی ہم یہ برداشت کرنے والے نہیں۔'

'وہ بالکل غلط کام تھا لیکن اس سے نمٹنے کا دوسرا راستہ ہے۔ مزدوری بند کرنے سے کیسے کام چلے گا؟'
'بہی ایک راستہ ہے۔ تم نہیں جانتے۔ تم بھینٹی میں نینا گیری کرو۔ گاؤں کی سیاست سمجھنا تمہارے بس کی بات نہیں۔'

میں اس سے بحث کرتا رہا اور وہ ضد میں آ کر ترکی بہ ترکی جواب دینے لگا۔ میرا مذاق اڑانے لگا۔ آخر مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے کہنے والا ہے کہ یہاں سے نکل جاؤ! تب میں نے بھانپ لیا کہ اسے سمجھانا بے سود ہے۔

جب میں گھر لوٹا تو بابا بیتابی سے میری راہ دیکھ

اتنا تناؤ پھیل گیا ہے۔ ایسی حالت میں ایک دم چلے جانا مجھے ٹھیک نہیں لگتا۔

’لیکن یہاں رہ کر بھی تم کیا کرو گے؟‘
اس کا کہنا بالکل صحیح تھا۔ ’کچھ بھی نہیں مگر میں نہیں چاہتا کہ کوئی بزدلی کا طعنہ دے۔ اس لئے یہیں رہوں گا۔‘

اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس نے کہا: ’لگتا ہے میری بات کو تم نے دل پر لے لیا۔‘

’نہیں، ایسی بات نہیں۔ میں کسی حد تک تمہاری بات کا قائل ہو گیا ہوں۔‘

’اب اس کا کچھ فائدہ نہیں۔ تمہاری کوئی نہیں سنے گا۔ قائل ہو گئے ہو تب بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو گے۔ کچھ کرو گے نہیں۔‘

’کیا کروں۔ تم ہی بناؤ میں کیا کروں۔ آج ہی میں اسحاق کے پاس گیا تھا۔ اسے بتایا کہ گاؤں کے لوگوں کو کام پر واپس لے لے لیکن اس نے میری بات نہ مانی۔‘

’ظاہر ہے، کیوں مانے گا! تم کیسے سوچ سکتے ہو کہ مسلمان تمہاری بات پر کان دھریں گے؟‘

’میرى بات پر اور بھی کون کان دھرتا ہے؟ کلواڑیوں نے کب میری بات مانی تھی؟ ایسی صورت میں کوئی کیا کر سکتا ہے؟ ستیہ گرہ؟ بھوک ہڑتال؟ میں ان بے وقوفی کی باتوں کو نہیں مانتا۔‘

’تم ستیہ گرہ بھی کرو تو کوئی تمہاری بات سننے والا نہیں، اس نے ایسے لہجے میں کہا جو مجھے کڑوا محسوس ہوا۔ اس کا وقت اب گزر گیا۔ قبضے میں کسی الگ تھلک رہنے والے اجنبی کی طرح لوٹنے کے بعد تم یہ موقع گنوا چکے ہو۔ جب تم نے یہاں سے اپنا رشتہ توڑ لیا اور چندرہ سال یہاں کا رخ نہ کیا تو یہاں کے لوگوں کو اپدیش دینے کا تمہیں حق نہیں رہا۔ اس عرصہ میں تمہاری اور ان کی زندگی میں جو تفاوت آ گیا ہے تم نے

کبھی اس کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ تمہارے احساسات شہری ہو گئے ہیں۔ تم ان لوگوں کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔‘

میں نے اس کی بات خاموشی سے سنی۔ اس کی باتیں بڑی حد تک بامعنی تھیں۔ اب تک میں اسے نصیحتیں کرتا رہا تھا، اب مجھے اس کی صلاح لینے کی ضرورت محسوس ہونے لگی! میں نے اس سے پوچھا، پھر اب تمہارا کیا خیال ہے؟ میں بہن چلا جاؤں؟

’مت جاؤ جو تم سوچتے ہو، ویسا کچھ نہیں ہوگا۔ ایسے جھگڑے کئی بار ہوئے ہیں۔ وہ اپنے آپ ہی سلجھ جاتے ہیں۔ دنیا میں کئی چیزیں آدمی کے خلاف ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ سے کوئی اپنے سر میں راکھ ڈال کر سنیاں نہیں لے لیتا۔‘

’پھر تم کیوں بہن جا رہی ہو؟‘

’میرى بات اور ہے۔ میں نے یہاں اپنی زندگی کو داؤوں پر لگا دیا اور ہار گئی۔ تمہارا معاملہ ویسا نہیں ہے۔‘

’میں نے بھی اپنی زندگی کو داؤوں پر لگا دیا ہے۔ اس کا مطلب کچھ اور ہے۔ تم نے پھر بھی کچھ تو کمایا ہے۔ لیکن میں تو اپنا سب کچھ گنوا بیٹھی ہوں۔ اب یہاں رہنے میں کوئی مزہ نہیں۔‘

’میں اس بات چیت کو جاری نہیں رکھ سکا۔ رسوائی گھر میں بید جس ہو گیا تھا۔ میں نے وہاں پڑا ہوا اخبار اٹھایا اور خود کو جھلنے لگا۔‘

’چھپکے کا دروازہ کھول دوں کیا؟‘
’نہیں، میں اب چلتا ہوں۔‘ میں نے کہا۔

’وہ کچھ نہ بولی۔ اس نے دور کی سی نگاہ سے میری طرف دیکھا۔ مجھے لگا وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن میں نے اس سے پوچھا نہیں۔‘

’تم بہن کب جا رہی ہو؟‘
’ہوئی کے بعد۔ تم سے مل کر جاؤں گی۔ اس نے جواب دیا۔‘

میں چلنے لگا اور مجھے محسوس ہوا کہ میرے ذہن کا

خلفشار اور بڑھ گیا ہے۔

’اسحق کے اندازے کے برخلاف کلواڑی اور بودھ راہ پر نہیں آئے۔ جن سے ہوسکا وہ بازار میں مزدوری کرنے لگے۔ باقی لوگوں نے مسلمانوں کے کھیتوں میں چوری کرنا شروع کر دیا۔ زمین کی بوائی کے لئے تیار کرنے میں جو سوکھے پتے استعمال ہوتے تھے، وہ اور کا جو چرا کر بازار میں بیچنے لگے۔ بانگوں سے پیڑ کاٹنے لگے اور ان کی ٹہنیاں جلانے کے لئے بازار میں بیچنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ کھیتی میں لگے ہوئے پیڑ برباد کئے جانے لگے۔ اتنی پھیلی ہوئی زمین کی رکھوائی کرنا مسلمانوں کے بس سے باہر تھا۔ ایک طرف سمجھوتے کی بات چیت چلی جا رہی تھی۔ اس میں زیر بحث آنے والے معاملوں میں اس چوری کو بھی شامل کر لیا گیا۔‘

یہ بات چیت ہمارے گھر کی برابر کی خالی جگہ میں ہو رہی تھی۔ کبھی دن میں، کبھی رات کو۔ وہاں کی باتیں مجھے گھر بیٹھے سنائی دیتیں۔ بابا ان بیٹھکوں میں جاتے تھے اور جب گھر آتے تو وہاں کی پوری روداد سناتے۔

لیکن اب میں نے ان روداد پر دھیان دینا چھوڑ دیا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ یہ طوفان خود بخود دُئل جائے گا۔ اس کی وجہ سے سب ہی کو تکلیف ہو رہی تھی۔ مسلمانوں کا کھیتی کے کام کا نقصان ہو رہا تھا۔ ان کے پیڑوں اور گھاس پھوس کی چوری ہونے لگی تھی۔ گھر میں اوپر کا کام کرنے کے لئے وقت پر آدمی نہیں ملتے تھے اور گھر کے کام کے علاوہ پانی بھی باہر جا کر خود لانا پڑتا تھا۔ مسلمانوں کے غریب کنبے اس حالت سے سخت پریشان تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ یہ جھنجھٹ آخر کب ختم ہوگی۔

لیکن اس جھگڑے کی زد سب سے بڑھ کر بودھوں پر پڑ رہی تھی۔ ان کو اب مزدوری کا کام ماننا دشوار ہو گیا۔ سارا دن بازار میں چھوٹے موٹے کاموں

مجھے اس بے آبروئی سے بچائیے۔
وہ رونے لگا۔ کسی نے کچھ نہیں کہا۔ اس کے
آس پاس بیٹھے کچھ لوگوں نے ذرا بے اطمینانی سے پہلو
بدلا، پھر سب خاموش ہو بیٹھے۔ میں نے بے چینی سے
پوچھا، تو پھر اب کیا کیا جائے؟
ٹھیک اسی وقت اسحاق نے منہ کھولا، لیکن جھگڑا
کیسے سلجھایا جائے؟ اس نے پوچھا۔ کس طریقے
سے؟ یہ تو بتاؤ۔

’طریقہ اور کیا ہوگا؟‘ میں نے کہا۔ ’دونوں
طرف سے غلطی ہوئی ہے۔ دونوں فریق اپنی اپنی غلطی
مان لیں۔‘

’اس کا کیا مطلب ہوا؟‘ چاروں طرف سے
آوازیں اٹھیں۔ ’جو کہنا ہے صاف صاف کہو۔ ایک شور
مچ گیا۔ کسی شخص نے زور زور سے بولنا شروع کیا۔ شاید
یہ سمتی کا چچیرا بھائی تھا، لیکن شور میں اس کی بات ٹھیک
سے میری سمجھ میں نہیں آئی۔‘

’بتاتا ہوں، بتاتا ہوں۔ میں نے شور کے
باعث زور زور سے چیخ کر کہنا شروع کیا۔ ہر ایک کو
قاعدے کی پابندی کرنی ہوگی۔ اسحق اپنے گھر میں کسی
پرانی عورت کو نہیں رکھ سکتا اور بودھوں اور کلواڑیوں کو
اس کے گھر میں گھسنے پر اس سے معافی مانگنی ہوگی۔ بس،
معاملہ ختم۔‘

’یہ کافی نہیں ہے۔‘ کلواڑیوں نے ایک دم شور
مچا دیا۔ ’بودھوں کی بے عزتی ہوئی ہے۔ کام سے نکالے
جانے کی وجہ سے بہت سے بے روزگار ہو گئے ہیں۔‘

اس کا کیا ہوگا۔ اس کا بھی فیصلہ ہونا چاہئے۔
’میرا بھی نقصان ہوا ہے۔ اسحاق مشتعل ہو کر
چلایا۔ ’مجھے باہر کے لوگوں کو زیادہ مزدوری پر رکھنا پڑا ہے۔‘
اس پر بانے کہا، اب یہ باتیں مت نکالو۔ پھر سے
بحث مت شروع کرو۔ یہ جھگڑا بس یہیں ختم ہونا چاہئے۔
’ٹھیک بات ہے۔ صرف معاملے کی بات
کرو۔ ہر بار اڑنے ان کی تائید کی۔‘

کوئی راستہ نکل آئے گا۔
میں بادل ناخواستہ اٹھا اور اس کے ساتھ بیٹھک
کی جگہ پر پہنچا۔ بیٹھک میں لوگ الگ الگ ٹولیوں
میں بیٹھے تھے اور آپس میں بات کر رہے تھے۔ مجھے
دیکھتے ہی وہ خاموش ہو گئے۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا۔
جنار دھن بھی میرے برابر میں بیٹھ گیا۔

وہ سب الگ الگ بسے ہوئے گھلوں کی طرح
الگ الگ ٹولیاں بنائے بیٹھے تھے۔ بودھ کلواڑیوں
کے برابر میں بیٹھے تھے۔ لکھیا اور کاشیا بھی ان میں
موجود تھے۔ بابا اور ہر بار اڑ پاس پاس بیٹھے تھے۔
ہر بار اڑ نے بابا کے کان میں کچھ کہا۔ پھر مجھ سے
مخاطب ہو کر بولا:

’زمیندار، تمہیں سب کچھ پہلے سے معلوم ہے۔
اب یہ بتاؤ کہ اس مسئلے کو حل کرنے کا راستہ کیا ہے؟‘
’آپ لوگوں کی بات چیت کہاں تک پہنچی ہے،
یہ مجھے معلوم نہیں ہے۔ آپ نے بلا یا، اس لئے میں آ
گیا ہوں۔‘

’ارے کیسی بات چیت؟‘ بابا نے کہا۔ ’دونوں
پارٹیاں اپنی اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہیں۔‘
’پھر میں کیا حل نکال سکتا ہوں؟ میری بات کسی
کو قبول نہیں ہوگی۔‘

’ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟‘ ہر بار اڑ بولا۔ ’تم کہو۔
ہم اس پر غور کریں گے۔ کیا خیال ہے؟‘ اس نے سب
لوگوں پر نگاہ ڈالی۔ مجھے لگا اسے اس جھگڑے کے سلجھنے
کی امید ہو چلی ہے۔

میں نے چاروں طرف دیکھا۔ لوگوں کے
چہروں پر مجھے کوئی اشتیاق دکھائی نہیں دیا۔ پھر بھی میں
نے کہا، اگر یہ جھگڑا ختم کرنا ہے تو ہر فریق کو تھوڑا بہت
جھکنا ہوگا۔

’ہاں، لکھیا نے کہا۔ وہاں موجود سو کے قریب
لوگوں میں سے صرف اسی کی آواز نکلی۔ ’میں آپ کے
پاؤں پڑتا ہوں۔ وہ بے بسی کے لہجہ میں بولا۔ آپ

کے لئے مارے مارے پھرنے لگے اور جوں جوں دن
گزرتے گئے، ان کو پیٹ بھر کھانے کے لئے بھی
مزدوری ملنا مشکل ہو گئی۔ چوری کا ہنر بھی ان میں سب
کو نہیں آتا تھا۔ پھر مسلمانوں نے پولیس کے پاس
رپٹ بھی لکھوا دی تھی اور گاؤں میں یہ فواہیں گرم تھیں
کہ پولیس تفتیش کرنے کے لئے آنے والی ہے۔

لیکن نہ بات چیت ختم ہو رہی تھی اور نہ جھگڑا
سلجھنے کا کوئی نشان دکھائی دیتا تھا۔ ایک دن جب
میں چوتھے پر بیٹھا ہوا تھا، جنار دھن وہاں آیا۔
مجھ سے بولا،

’آپ کو بلا یا ہے؟‘
’مجھے؟ کیوں؟‘
’کوئی راستہ نکالنے کے لئے۔‘
’میں کیا راستہ نکالوں گا؟‘

’آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟ کیا آپ نے طے
کر لیا ہے کہ لوگوں کے مانگنے پر بھی صلاح نہیں دیں گے؟‘
’نہیں، میری صلاح وہ مانگنے کے نہیں، یہ مجھے
معلوم ہے۔ اس لئے میرا وہاں جانے کو ہی نہیں چاہتا۔‘

’مانیں نہ مانیں، یہ ان کا مسئلہ ہے۔ آپ کو اپنا
فرض پورا کرنا چاہئے۔‘
’فرض ورض کی باتیں مجھے مت سکھاؤ۔ میں
نے تلخی سے کہا۔ ’کیا ان لوگوں کا کوئی فرض نہیں؟‘

’ہے کیوں نہیں؟ اسی لئے تو وہ آپ کو بلانے پر
راضی ہوئے ہیں۔ اب آپ ٹالنے مت۔ آپ نہ آئے
تو کہیں ایسا نہ ہو کہ جھگڑا نمٹانے کا موقع ہاتھ سے نکل
جائے۔‘

میں نے بھابھی کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہنے
سے کتر رہی تھی۔ پھر میرا ارادہ بھانپ کر بولی، ’آپ کو
جانا چاہئے۔ آپ کی وجہ سے یہ جھگڑا سلجھ جائے گا۔‘
’اور جا کے ان سے کیا کہوں؟‘

’آپ پہلے میرے ساتھ چلے تو سہی جنار دھن
نے کہا۔ ہم کھل کر پوری بات کریں گے۔ اسی میں سے

آپ کو عادت نہیں ہے۔ گلا بیٹھ جائے گا۔ کھانسی ہو جائے گی۔

’ہونے دو۔ میرے سگریٹ ختم ہو گئے ہیں۔‘
لیکن وہ اپنی جگہ سے نہ سرکا۔ اس نے لائین
جلائی۔ اس کی بتی اکسانی اور لائین کو اوپر ٹانگ دیا اور کان
میں اڑسی ہوئی آدھی بیڑی سلگا کر اس کے کش لینے لگا۔

آہستہ آہستہ پورا قصبہ اس عجیب گولے میں
گھرتا گیا۔ شمسو کی دکان کے گاہک کم ہوتے گئے۔
اس کی دکان مہارواڑے کے بالکل پاس تھی،
مسلمانوں کے محلے کنارے پر۔ اس کے سارے
گاہک کھواڑی اور بودھ تھے۔ وہ آنے بند ہو گئے اور
شمسو دن بھر فکر کی کیفیت میں دکان میں بیٹھا بیٹھا
کھیاں مارنے لگا۔

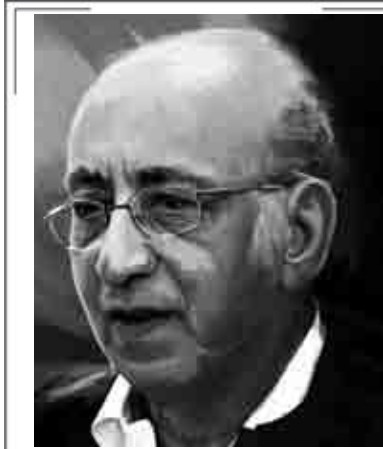
صرف ہر بار اوٹنگوٹی پہنے اس کی دکان میں آتا
رہا۔ وہ ہمیشہ کی طرح شمسو سے کہیں مارتا تھا لیکن اس
کی باتوں میں پہلے والے موضوع اب نہیں آتے
تھے۔ اب صرف لکشمی کا موضوع رہ گیا تھا اور اس کی
وجہ سے اسحاق نے جو ہنگامہ کھڑا کیا تھا اس کا۔

لیکن لکشمی تھی کہاں؟ کسی کو کچھ نہیں معلوم تھا۔
اس سارے ہنگامے میں اس کا کسی کو خیال نہیں آیا تھا۔
اسحاق بھی اسے یاد نہیں کر رہا تھا۔ بودھوں اور کھواڑیوں
کے گھر میں گھس آنے سے اسے جو زخم لگا تھا وہ اسے
متواتر تکلیف دے رہا تھا۔ وہ ان سے بدلہ لینا چاہتا
تھا۔ بدلہ لینے کا خیال اس کے تن بدن میں آگ لگائے
ہوئے تھا۔ وہ اپنی بے عزتی کا حساب برابر کرنے کو
بیٹاب تھا۔

قبضے کے پچھم طرف بننے کی کھولی ہوئی دکان
کی بھی اب وہی حالت ہونے لگی۔ اس کے مسلمان
گاہک کم ہوتے گئے۔ ہندو بستی بہت دور تھی اس لئے
وہاں سے گاہک اس کی دکان پر نہیں آتے تھے۔ وہ شہر
سے لوٹتے ہوئے اپنا چھوٹا موٹا سودا سلف لے آتے۔
بننے کی بیوی کی حالت بہت عجیب ہو گئی۔

’چلو، شام ہو گئی، چلتے ہیں۔‘ آخر باہانے کہا اور
دھیرے سے اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ وہ لاٹھی ٹیکتے
ہوئے باہر نکل گئے۔ ان کے بعد ہر بار اوٹنگوٹی چلا گیا۔
میں اور جنار دھن بھی چل پڑے۔ میرا گھر جانے کو جی
نہ چاہا۔ میں اس کے ساتھ اس کی دکان پر چلا گیا۔

اب اندھیرا ہو گیا تھا۔ میں دکان میں گیا، اور
بیچ پر بیٹھا پر بیٹھ کر اندھیرے میں جنار دھن کی بیڑیاں



’نیادور کے بھدر اصرار پر جدید دور کے مشہور شاعر
اور فلمی دنیا کے معروف نغمہ نگار نفا فاضلی کی شریک حیات
محترمہ مالتی جوشی نے نفا صاحب کی زندگی کے مختلف
پہلوؤں پر مضمون ارسال کر دیا ہے۔ نفا فاضلی کی
دوسری برسی پر فروری ۲۰۱۸ء کے نیادور میں ایک گوشہ
شائع کیا جائے گا جس میں جاوید اختر، راجیش ریڈی،
شاہنواز قریشی، مظہر احمد، حسن کاظمی، عائشہ ضیاء وغیرہ
کے مضامین کے علاوہ نفا فاضلی کا کلام اور ان کی دیگر
تخلیقات کے اقتباسات بھی شامل رہیں گے۔‘

ایک ایک کر کے پھونکنے لگا۔ میں بالکل سن بیٹھا ہوا
تھا۔ مجھے پتا نہ لگا کہ میں کتنی بیڑیاں پی گیا۔ آخر اس کا
بیڑیوں کا بنڈل ختم ہو گیا۔

’بیڑیاں ختم ہو گئیں۔‘ جنار دھن مجھے تیکھی نگاہ
سے دیکھنے لگا۔

’بننے کے پاس ہوں گی۔ لے آؤ۔‘
’لیکن کتنی بیڑیاں پیئیں گے؟ بیڑی پھونکنے کی

اچانک سمتی کا پچھرا بھائی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس
کے اٹھتے ہی شور مچ گیا۔ سب لوگ اس کی طرف دیکھنے
لگے۔ اس نے کہا، ’ایک اور بات کی وضاحت بھی
ضروری ہے۔‘

وہ میری طرف دیکھنے لگا۔ ’میں بے چینی محسوس
کرنے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا، کس بات کی؟‘
’ایسا کوئی واقعہ دوبارہ نہ ہو، اس کی ضمانت دی
جانی چاہئے۔‘

’ہاں، ہاں، ضمانت ملنی چاہئے۔ ان گنت آوازیں
بلند ہوئیں۔ کھواڑیوں کی اور بودھوں کی آوازیں۔‘

’اس سمجھوتے کا مطلب آئندہ کے لئے ایک
طرح کی ضمانت ہی ہے۔ الگ سے کس بات کی
ضمانت دی جائے۔‘

’ہرگز نہیں۔ آج یہ جھگڑا سلجھ گیا، اس کا مطلب
یہ کہاں سے نکلا کہ آئندہ ایسا کچھ نہیں ہوگا؟ اس کا کیا
کیا جائے؟‘

’اس کی ضمانت میں کیسے دے سکتا ہوں؟ کیا
میں ہمیشہ یہاں رہوں گا؟ اور میری ضمانت کی حیثیت
کیا ہے؟ اور پھر کون یہ ضمانت دے سکتا ہے کہ یہ واقعہ
آئندہ پھر کبھی نہیں ہوگا؟ آخر ہم سب انسان ہی ہیں۔
جہاں لوگ ہوں گے وہاں جھگڑے چھیلے تو ہوں گے
ہی۔ ہمیں چاہئے کہ انہیں بات چیت سے سلجھالیں۔‘

’نہیں! لفظوں کا ایک بے پناہ ریلا میرے
کانوں سے نکلے۔‘ ضمانت کے بغیر سمجھوتہ نہیں ہوگا‘
کسی نے زور سے چیخ کر کہا۔ مجھے آگے کچھ کہنے کا موقع
ہی نہیں دیا گیا۔ وہ سب جلدی جلدی اٹھ کر جانے
لگے۔ دروازے کے پاس ایک دم بھیڑ لگ گئی۔ میں
ٹن سا بیٹھا رہ گیا۔

سب لوگ چلے گئے۔ صرف میں، بابا، ہر بار اوٹنگوٹی
اور جنار دھن رہ گئے۔ کچھ دیر ہم سب ساکت بیٹھے
رہے۔ مجھے بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ
فوراً اٹھ کر چل دوں۔ لیکن مجھے اٹھ کھڑے ہونے کا

’میری بات دھیان سے سنئے۔ اس سال جب پاکی کا جلوس نکلے گا تب اسے مسجد کے سامنے سے باجا بجاتے ہوئے گزارنے کا منصوبہ ہے۔ اگر مسلمانوں نے اسے روکنے کی کوشش کی تو...‘ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

’انہوں نے روکنے کی کوشش کی تو کیا ہوگا؟ اس کا جواب دیا جائے گا، یہی نا؟‘

’ہاں، یہی۔ لائٹوں اور ڈنڈوں سے۔ آپ، یعنی ہم دونوں، اس لڑائی کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔‘

’یہ کوشش بیکار ہوگی۔ کوئی بھی سننے کو تیار نہیں ہے۔ میرا بولنا مسلمانوں کو اچھا نہیں لگے گا اور گلواری اور بودھ مجھ پر یوں بھی یقین نہیں کرتے، پہلے کرتے تھے، جب انہیں زمینداروں کی زمینیں چاہئے تھیں۔ اب نہیں کرتے۔ ورنہ بھائی کے ساتھ ہوئے جھگڑے میں وہ میری بات نہ مان لیتے۔‘

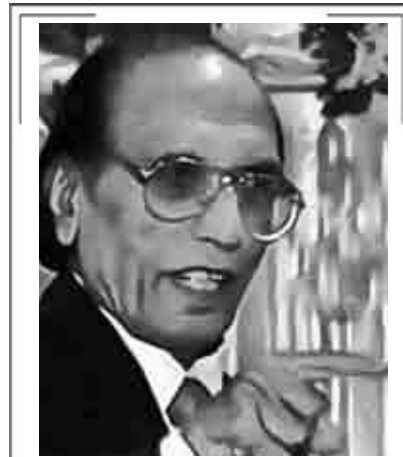
’تو پھر جو ہونے والا ہے، اسے ہونے دیا جائے؟‘
’ہاں۔ اور کوئی راستہ نہیں۔‘
’نہیں۔‘

’نہیں۔ ہم ہونے والی بات کو روکنے کی طاقت نہیں رکھتے۔‘

جنار دھن کے ناخاندہ چہرے پر خیا لوں کے جالے تن گئے۔ شاید میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا، مگر پھر گاندھی جی کیا کرتے تھے؟
’تم گاندھی ہو کیا؟‘
’نہیں۔‘

’ہم عام لوگ ہیں۔ ہمیں عام لوگوں جیسا ہی برتاؤ کرنا چاہئے! جہاں تک میرا سوال ہے، فی الحال میں نے یہی طے کیا ہے کہ بزدلوں کی طرح قصبہ چھوڑ کر بمبئی نہیں جاؤں گا۔‘ (بٹکر یہ ’ہج‘) (جاری)

اور مراٹھوں کو وہ اس میں شامل نہیں کرنا چاہتے۔ اکھاڑے شروع ہو گئے ہیں۔ لائٹی واٹھی چلانا سکھایا جا رہا ہے۔ آپ کے محلے میں کیا ہو رہا ہے، وہ میں نہیں جانتا لیکن وہاں بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا ہوگا۔ اس کا کوئی برا نتیجہ لگ رہا ہے۔
’پھر ہم کیا کریں؟‘



مقبولیت کی بلندیوں کو سر کرنے والے عہد جدید کے مشہور شاعر بشیر بدر گزشتہ کافی عرصہ سے بسترِ علالت پر ہیں۔ بشیر بدر پر ایک بھرپور گوشہ جلد ہی ’نیا دور‘ میں شائع ہوگا جس میں ان کی اہلیہ محترمہ راحت بدر کے علاوہ اسکے شعری فن اور یادوں پر مبنی ’دیم بریلوی‘، ڈاکٹر تنیق اللہ، پروفیسر احمد محفوظ، ریشما پروین، مست حفیظ رحمانی وغیرہ کے مضامین اور بشیر بدر کا منتخب کلام شامل ہوگا۔

’تو کیا کچھ بھی نہ کریں؟‘

’کچھ نہیں کیا جاسکتا۔‘

’مگر کیوں؟‘

’کیونکہ ہماری کوئی نہیں سنتا۔‘

اسے لگ کہ اگر حالات یہی رہے تو دکان بڑھا کر شہر واپس جانا پڑے گا اور اگر یہیں رہے تو زیادہ مشکلوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہر قسم کی مشکلوں کا! کب کس طرح کی مشکل پیش آجائے اس کا کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا تھا اور مشکلیں بتا کر نہیں آتیں۔

جب اس کا شہر شہر گیا ہوا ہوتا تو اسے اور زیادہ ڈر لگنے لگتا۔ اگر کوئی مسلمان اچانک گھر میں گھس آیا تو وہ کیا کرے گی؟ اس نے جنار دھن نے جان پہچان پیدا کر لی۔ وقتاً فوقتاً اسے پکار کر وہ اس کا حال چال پوچھنے لگی۔ بلا کر اس سے پوچھی، ’جنار دھن بھیا! آج زیادہ گا بک نہیں ہیں، کیوں؟‘ آج جلدی دکان بڑھا دی کیا؟‘ ’کیوں؟ آج بہت دیر ہو گئی؟‘ ’تھوڑی دیر رک جائے نا، ان کو آ لینے دیجئے۔ مجھے اکیلے ڈر لگتا ہے‘ ’دیکھو! مسلمانوں نے کیسا جھگڑا شروع کر دیا ہے!‘

جنار دھن کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کے بھی مسلمان کا ہک ٹوٹ گئے تھے۔ اس کے بلونے والے مستقل گا بک بھی اب اس کی دکان میں پیر نہیں دھرتے تھے۔ اس کا پورا دن استرا تیر کرنے میں گزارتا لیکن استرا بھلا کب تک تیر کیا جاسکتا ہے؟

ایک دن میں بال کٹوانے اس کی دکان میں داخل ہوا۔ اس نے مجھے صاف بتا دیا کہ اس کے پاس گا بک آنے بند ہو گئے ہیں۔ بال کٹوانے کے بعد میں وہاں کچھ دیر بیٹھا رہا۔ اس نے مجھے ایک بیڑی دی جو میں نے لے لی۔ ہم دونوں بیڑی پیتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ بیچ میں اس نے مجھ سے پوچھا، اس جھگڑے کا کیا ہوگا؟
’میں نہیں جانتا۔‘

’لیکن ہمیں ایک کوشش اور کرنی چاہئے۔ اس نے مجھ سے کہا، ’جو کچھ ہو رہا ہے وہ ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں ہے کہ اصل میں ہو کیا رہا ہے۔‘
’مجھے کچھ بھی نہیں معلوم۔‘ میں نے دوبارہ کہا۔
’تو پھر سنئے! کلواریوں اور بودھوں کی روز رات کو سجا ہورہی ہے۔ چندہ جمع ہو رہا ہے۔ نائیوں



ہیرٹا منولر
جرمنی

پستی

پاؤں نے تصویر دراز میں رکھ کر مجھ سے پوچھا،
اس وقت پچاس کی دہائی میں تمہارے باپ کیا
کرتے تھے؟

پارٹی کے کارکن تھے، میں نے کہا، بے دخلی
والے محکمے میں تھے۔ پڑوس کے گاؤں کی پہاڑی پر
میرے دادا کے انگور کے باغ تھے۔ خوشبودار کیونسٹ
نے ان کے طلائی سکوں اور زیوروں کو ضبط کر لیا ساتھ
ہی انہیں اور میری دادی کو بارانگان در بدر کئے جانے
والے افراد کی فہرست میں ڈال دیا۔ جب میرے دادا
واپس پلٹے تو گھر پر حکومت قابض ہو چکی تھی۔ انہیں
مقدمہ دائر کر کے گھر واپس ملا۔ ڈبل روٹی کے
کارخانے کے دفتر ہمارے گھر کے کمروں میں ہوتے
تھے۔ گھر کے بارے میں تو کافی باتیں ہوتی تھیں لیکن
میرے دادا اور دادی کے بارے میں کبھی کبھی ہی گفتگو
ہوتی تھی۔

اس نے جلدی مرنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔
بیچاری پہلی گرمیاں بھی نہیں گزار سکی۔ وہ انظار نہیں
سکتی تھی اور گارے کے گھر کے ساتھ وہ زندہ نہ رہ سکی۔
میری شادی کے دن خوشبودار کیونسٹ پہلی بار پھر سے
ہمارے قصبے میں آیا، بغیر کچھ سوچے، یہ ہمیں بعد میں
معلوم ہوا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ اسے کوئی نہیں جانتا یا
شاید یہ بھی سوچا۔ علاقہ کی عوام اس کے لئے ملک پر
بوجھ سے بڑھ کر کچھ نہیں تھی۔ شاید اس نے اس
جوڑے کو پہچان لیا تھا جو اس کی خدمت کر رہے تھے۔
ایسے بدخصلت افراد کے نام وہ فہرست وار جانتا تھا۔

نتھنے پھلا لے، جب تک اندر سرسری نہیں ہوتی، یہ
چھینکے روکنے کا نسخہ ہے۔ اگر وہ جلدی چھینکنا بند نہیں
کرتا تو اس کی آنکھیں پانگے کے پھل کی طرح ہو
جائیں گی۔ چھلانگ مار کر باہر نکل لے، میرا کیا جاتا
ہے، اس کا گلہ محنت سے لال ہو گیا ہے، کان جل
رہے ہیں، اب وہ ساتویں مرتبہ چھینک رہا ہے،

جرمن زبان کی مقبول ادیبہ ہیرٹا منولر ایک
عالمی شہرت یافتہ ناول نگار ہیں۔ The Passport،
The Land of Green Plums
Appointment وغیرہ ان کی مشہور ناول ہیں۔

انہوں نے ایک فرم میں بطور مترجم اپنے ادبی
سفر کا آغاز کیا لیکن ۱۹۷۹ء میں اس فرم کو چھوڑنے کے
بعد باقاعدہ طور پر تحریر کے میدان میں آگئیں۔ ہیرٹا
منولر کو ۲۰۰۹ء میں ادب کے نوبل انعام سے سرفراز کیا
گیا۔ پیش ہے ان کی مشہور ناول 'پیشی' جس کا اردو
ترجمہ علی مہذب رضانے کیا ہے۔

(ایڈیٹر)

آک چھیں... دیکھ کر ہی میرے دماغ میں ہوا بھر
رہی ہے۔ آئندہ اسے آک چھیں بولنے کے بجائے
کسی اور طرح سے چھینکنا چاہئے۔ لگتا ہے بس اب
ختم۔ نہیں! آٹھویں مرتبہ چھینک رہا ہے، اس
میں کچھ نہیں بچے گا۔ چھینک چھینک کر جان نکل
جائے گی۔ سکڑ کر ریٹ کی ایک گولی بن کر رہ
جائے گا۔

ٹرام لائٹ پر کھڑی ہو جاتی ہے۔ پھر لال،
کنڈکٹر کہتا ہے، کس کے لئے، پورا ہفتہ کوئی بندہ
سڑک پر قدم نہیں رکھتا مگر یہ بیٹھے بتیاں بنا رہے ہیں،
اور دفتر میں مزے سے بیٹھے ہوئے ہم پر چسپاں کئے
جارہے ہیں۔ یہ نہیں کہ کوئی شہر میں آکر جتنی کو دیکھے تو
سہی، ان کے لئے انہیں انعام و اکرام سے نوازا
جاتا ہے اور مجھے نہیں دیتے کیونکہ میں نے سفر طے
کرنے میں تاخیر سے کام لیا ہے۔ ٹھہرے ہوئے
مسافر لائٹ دیکھ رہے ہیں اور خاموش ہیں۔ ان
میں سے ایک چھینکتا ہے، ایک مرتبہ، اور دوسری
مرتبہ اور تیسری مرتبہ، لائٹ سے تو چھینک نہیں آتی،
دھوپ سے آتی ہے، اور چوتھی بار اور پانچویں بار۔
میرے لئے ناقابل برداشت۔ جب اتنے دبلے
پتلے انسان اتنا زیادہ چھینکتے ہیں، ٹھہر نہیں سکتے، تیز
نام کو نہیں ان میں، یہ نکلے، زیادہ سے زیادہ ایک
مرتبہ منہ پر ہاتھ رکھیں گے، اس کے بعد تو نہیں۔ ہر
مرتبہ یہی امید کرتے ہیں کہ یہ آخری مرتبہ ہے اور
اگلی مرتبہ کا انتظار نہیں کرتے ہیں، مارتے جاتے
ہیں، دماغ خراب ہو جاتا ہے، شمار کرنا پڑتا ہے، مدد
کو آگے آنا پڑتا ہے۔ اب وہ چھٹی مرتبہ چھینکتا ہے،
یہ نہیں کہ ناک دبالے اور سات بار ہوا کو منہ سے
لیکے جتنی بھی ضرورت ہو، پھر ختم ہو جائیں گی۔ ایسا
کچھ جانتا ہی نہیں، کیا میں اسے پورے ڈبے میں چلا
کر بتاؤں، نہیں، ہوا نکلنا چھینک روکنے کا نسخہ نہیں
ہے۔ سات مرتبہ ہوا نکلنا نچکیوں میں کام آتا ہے،

’چھپرے، نہ دائیں دیکھ نہ بائیں، سیدھے ہی سیدھے جا، لیکن پھیلا بنے ہوئے۔‘
پھر وہ میرے سر پر ٹوپی دبا کر رکھتے تھے ایسے کہ بائیں کان پر دائیں سے زیادہ ہو اور ہم آگے جاتے تھے۔ چوراہے پر وہ آنکھیں سکوڑتے ہوئے کہتے تھے:

’پہلے بائیں پھر دائیں دیکھ میرے بیٹے! دیکھ کوئی کار تو نہیں آرہی۔ چلتے ہوئے یہ ضروری ہے، سوچتے ہوئے نقصان نہ۔‘

صرف ایک بار شہر میں مجھ سے ملنے آئے تھے۔ فخر تھا انہیں کہ اس بینارجمتی عمارت میں مقیم ہوں جو ہمارے گھر کی بہ نسبت بہت الگ ہے۔ جس کی ناک کے آگے پہاڑ کھڑا ہے۔ وہاں ہوا ہے اور نیچے سب نظر آتا ہے۔ وہ باہر بالکنی کے نیچے سے گزرے ہیں، پھر دیکھنے پھر کبھی نہیں آئے۔ انہیں اوزار اور اینٹینے نظر آئے تھے اور انہوں نے پوچھا تھا:

’کیا رے! یہاں کالا دھندا کرتا ہے؟‘

یہ کہ یہ اینٹینے غیر ملکی پروگرام دیکھنے کے لئے ہیں اور پھر ایسی الفاظ جیسے کسی تیسرے فرد کے بارے میں بول رہے ہوں۔

میرے بیٹے کو پیسے کا چمکا ہے اور اس لئے سوشلزم اس کے لئے مذاق بن کر رہ گیا ہے۔ اور پھر کیا آئے گا، خالص سرمایہ دارانہ نظام۔ اس وقت بندہ تھک کر گر جانے کی حد تک اینٹینے بنا سکتا ہے لیکن جن مالدار لوگوں کے لئے وہ تیار ہو رہے ہوتے ہیں، وہ ان کی اوقات تک نہیں پہنچتا۔

میں نے کہا، پیسے کمانا مذاق نہیں ہوتا اور اس پر پابندی بھی نہیں ہے۔

تب ان کا کہنا تھا، اس کی اجازت بھی نہیں ہے، پرتو نے پوچھا کس سے ہے؟

کپٹن لوم سے کیا مطلب ہے، میں نے کہا، میں ڈالر تو نہیں کما رہا، اور یوگوسلاویا اور ہنگری میں بھی

بال بھی نہیں اُگے تھے۔ مجھے فخر محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے داڑھی مونڈنا شروع کر دی اور پارٹی کا کارکن ہو گیا۔ میرے باپ کے نظریے کے مطابق یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ ہوتی ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ وہ وقت سے پہلے پیدا ہوئے تھے اور وقت کے ساتھ ساتھ ہی انہیں چلانا ہے۔

میں وقت پر پیدا ہوا ہوں اور مجھے وقت کے مقابلہ پیش قدمی کرنا ہے۔ اس وقت کافی لوگوں کی ضرورت تھی جو اپنی روایتی زندگی سے تپوں کی طرح سرک کر باہر آگئے۔ جو انتہائی غربت کا شکار ہوتا وہ کمیونسٹ بن جاتا تھا اور بہت سے امیر افراد بھی جو اذیتناک کیسوں میں نہیں جانا چاہتے تھے۔ اب میرے باپ نہیں رہے اور اوپر، اگر جنت نام کی کوئی حقیقت ہے تو وہاں خود کو عیسائی بتاتے ہوں گے۔ موٹر سائیکل ان کی تھی، میری ماں فخر تھی۔ اب وہ رٹائر ہے اور ہر دو شنبہ کو مارکیٹ میں چوک والی لوہے کی دکان پر اپنی بریڈ کے جھری دار کامریڈوں کو ملتی ہے۔

بچپن میں جب میں اپنے باپ کے ساتھ شہر جاتا تھا وہ تو پبلک پارک میں آویزاں اعزازی بورڈ پر بہترین مزدور کے خطاب سے نوازی گئی اپنی تصویر دکھایا کرتے تھے۔ مجھے گلہ بیاں دیکھنے کا زیادہ شوق تھا۔ ان سب کا نام ’ماریا نا‘ ہوتا تھا اور وہ کدو کے بیج توڑ کر کھانے میں مشغول ہوتی تھیں کیونکہ لوگوں کے پاس میوا نہیں ہوتا تھا۔ پارک کے داخلی دروازے پر کدو کے بیج خریدے جاسکتے تھے۔ استحصال ہے یہ، ایک ’لوئے‘ میں ایک مٹھی کدو کے بیج۔ وہ مجھے خرید کر نہیں دیتے تھے۔

گلہ بیاں اپنا پیٹ خود ہی بھر لیتی ہیں۔ میں خالی ہاتھ لئے آواز لگاتا تھا۔ ماریا نا! اور وہ ویسے ہی چلی آتی تھیں۔ آواز دیتے ہوئے میں ہاتھ کو پیٹ کی جیب میں رکھتا تھا۔ شاہراہ پر اعزازی بورڈ کے سامنے میرے باپ کہتے تھے:

ان کے چہرے سے آشنا نہ تھا۔ میری مرحومہ ماں کا شمار بھی ان ان متعدد مرحوم لوگوں میں تھا جو اس کے سبب مرے تھے۔ جب وہ دوبارہ آیا تو جشن منانا چاہتا تھا۔ اس کی رفتار و گفتار سے میرے دادا سے فوراً پہچان گئے تھے حالانکہ اس نے ایک نئے نام سے اپنا تعارف کرایا تھا۔ اس کا پہلے والا نام ہی اصلی تھا۔ وہ ایک کوچوان کا بیٹا تھا جس نے جنگ کے بعد اپنے دو بھورے گھوڑوں کے سر پر کوچوان بن کر اپنی زندگی بنائی تھی۔ وہ گھروں میں لکڑی، کولہ، چونا، سینٹ وغیرہ لے کر آتا تھا۔ جو لوگوں کے لئے نقاشی کی ہوئی شاندار گھوڑا گاڑیوں کے اخراجات ناقابل تحمل ہوتے تھے تو وہ تابوت بھی قبرستان لے جایا کرتا تھا۔ جتنا اس نے زندگی میں پیسہ دیکھا ہوگا، اس سے زیادہ اس نے گھوڑے کا فضلہ اٹھایا تھا۔ گھوڑوں کو تھکن سے بچانے کے لئے اس کے دونوں بیٹے بھری ہوئی گھوڑا گاڑی کے عقب میں دوڑتے تھے اور جب گاڑی منزل پر رکتی تھی تو اس سے مال اترواتے تھے یا نیچے سے کھودنے کا کام کرتے تھے یا اپنی پشت پر بورے ڈھوتے تھے۔ سفید گھوڑا کام کرنے والے گھوڑوں سے چھٹکارا دلانے کے لئے میرے سر کے لئے ایک تحفہ تھا۔ سلی پر بیٹھے ہوئے کسی بندر کی طرح وہ اس پر سوار ہو کر گاؤں بھر میں گھومتا تھا اور ان سب سے نفرت کرتا تھا جو کوچوان سے زیادہ امیر ہوتے تھے۔ عطر اس کی دوسری خاصیت تھی۔ ایک خوشبودار کمیونسٹ کیسے ہو سکتا ہے یہ؟ میں نے پاؤں سے پوچھا۔ کیا وہ حقیقتاً ایک کمیونسٹ تھا؟

’میں؛ پاؤں بولا۔ ’میری پرورش شریفانہ ماحول میں ہوئی تھی۔ میں اپنا ہوم ورک کر رہا تھا تو میرے باپ نے مجھے باورچی خانے میں بلایا۔ ان کا شیو کا سامان میز پر پڑا ہوا تھا اور چولہے پر پانی گرم ہو رہا تھا۔ انہوں نے میرے چہرے پر نختوں پر صابن کا جھاگ لگا یا اور پھر چھری لے آئے۔ اس وقت تک دس نظاروں میں میری داڑھی کے سات

سوئٹلز م ہے، جیسے یہاں ہے، ٹی وی میں بھی۔

گزشتہ کچھ عرصہ سے پارٹی میں منافع خور زیادہ اور جدوجہد کرنے والے کم ہیں۔ وہ بولے، کل ملا کر پیسہ کردار پر دھبہ لگا دیتا ہے۔

مگر تم اپنے بیٹے کی بات کر رہے ہو، میں نے کہا، تمہارا ایک ہی ہے، اور وہ میں ہوں، اور تم نے کیا حاصل کیا ہے؟ کس دھندے میں ہو؟ پچھلے لوہے کے، جس سے ٹرکٹر بنتے ہیں اور کیا ہے اس کے علاوہ؟ جنت ابھی زمین پر نہیں ہے مگر تمہارے دماغ میں لال رنگ کی بہار ہے۔ جب تم خدا کی بارگاہ میں جاؤ گے تو وہ تمہاری پیشانی کے نور کو دیکھ کر پوچھے گا، ارے آگئے میرے گنہگار، میرے لئے کیا لے کر آیا ہے؟ دو عدد سڑے ہوئے پھوپھڑے، ریڑھ کی گلی ہوئی ہڈی، آنکھوں میں مہلک ورم، بہرا پن اور ایک غلیظ اور میلا لباس، تم کہو گے۔ دوسرا سوال ہوگا، اور زمین پر کیا چھوڑ کر آیا ہے؟ اپنی پارٹی کی رکنیت کا کتابچہ، ایک ٹوپی اور ایک موٹر سائیکل۔

میرے باپ ہنسنے لگے۔ اوئے ہوئے، ایسی نوبت تب آئے گی، جب تو خدا بن جائے گا۔ مگر معلوم ہے تجھے، میں وہاں اوپر جا کر تیرے سبب شرم سے گڑ جاؤں گا کیونکہ وہاں سے چھتوں پر کالے دھندے کے سامان شطرنج کی بساط کی طرح نظر آتے ہیں۔

میری زبان پر تو تالا پڑ گیا، پر ان کی نہیں۔ گھڑی دیکھ کر انہوں نے کہا: امید ہے کہ ایک شہر میں دو تین فیصدی ہی ایسے ہوں گے جنہیں غیر ملکی پروگراموں کی ضرورت ہوگی اور جب ان چغل خوروں کے پاس تمہارے اٹیئے پہنچ جائیں گے تو تمہاری تو چھٹی ہو جائے گی۔

میں نے کہا، تم بہت برے ہو، بوڑھے اور حسد کرنے والے ہو، حتیٰ کہ مجھ سے جلتے ہو۔

میرے باپ بغلیں جھاکنے لگے۔ انہوں نے

اپنی ٹوپی بائیں جانب قدرے خم دے کر پہنی۔ بالکل اسی طرح جس طرح اعزازی بورڈ پر میں نے پہنی تھی۔ اب وہ خود بھی ایسے ہی پہن رہے تھے۔ گھڑی دیکھ کر بولے، اب ان سب کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اب مجھے بھوک لگی ہے۔

تمہارے باپ ناراض تھے۔ ورنہ وہ اتنے چڑچڑے طریقہ سے نہ بولا کرتے۔ مگر وہ دوسروں کے لئے خطرہ نہیں تھے۔ میرا سسر اپنی جسمانی قوت سے اوپر چڑھا تھا اور کسی انسان کو نہیں بتائے

مگر تم اپنے بیٹے کی بات کر رہے ہو، میں نے کہا، تمہارا ایک ہی ہے، اور وہ میں ہوں۔ اور تم نے کیا حاصل کیا ہے؟ کس دھندے میں ہو؟ پچھلے لوہے کے، جس سے ٹرکٹر بنتے ہیں اور کیا ہے اس کے علاوہ؟ جنت ابھی زمین پر نہیں ہے مگر تمہارے دماغ میں لال رنگ کی بہار ہے۔ جب تم خدا کی بارگاہ میں جاؤ گے تو وہ تمہاری پیشانی کے نور کو دیکھ کر پوچھے گا، ارے آ رہے میرے گنہگار، میرے لئے کیا لے کر آیا ہے؟ دو سڑے ہوئے پھوپھڑے، ریڑھ کی خراب ہڈی، آنکھوں میں مہلک ورم، بہرا پن اور ایک غلیظ اور میلا لباس، تم کہو گے۔ اور زمین پر کیا چھوڑ کر آیا ہے؟ اپنی پارٹی کی رکنیت کا کتابچہ، ایک ٹوپی اور ایک موٹر سائیکل۔ تم کہو گے۔

گا کہ وہ کس طرح گرا تھا لیکن یہ سب لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ خوشبودار کمیونسٹ کیسے گھوڑے پر سوار ہو کر گھروں کے سامنے سے گزرتا تھا۔ اپنے سفید گھوڑے کو سایہ دار درخت کے نیچے کھڑا کرتا اور چابک کو گھوڑے کی لگام میں پھنسا دیتا تھا۔ یہ سب کو معلوم ہے اور یہ بھی کہ اس سفید گھوڑے کا نام 'نونیس' تھا۔

میرے دادا بتاتے ہیں کہ گاؤں والوں کو گھر سے بھوسا اور تازے پانی کی ایک بالٹی اسے

لا کر دینا پڑتی تھی۔ گھوڑا کھاتا پیتا تھا، اور اس درمیان گھڑسوار اناج اور سونے کی تلاش میں گھروں میں اٹھا پنک کیا کرتا تھا۔ اس کے پاس موجود کاغذات میں کھیتوں کے نقشے بالترتیب درج ہوتے تھے۔ ہر بے دخلی کے بعد وہ گھوڑے کے پاس واپس آتا تھا اور چابک کو گھوڑے کی پشت سے اتارتا تھا۔ چابک کی ڈوری کے سرے پر ایک ریشمی گچھا ہوتا تھا اور اس کے آخر میں سینک سے بنا ہوا پتھرا رکھتا تھا۔ بیچ کھول کر وہ اس میں سے اپنی پٹسل نکالتا تھا اور جیب سے کاغذ نکال کر ایک نمبر کاٹ دیتا تھا۔ جب وہ گاؤں میں گھڑسواری کرتا تھا تو اس کے عقب میں کتے بھونکتے تھے۔

کتوں کو محسوس ہوتا تھا کہ یہ سفید گھوڑا ان کے گاؤں کا سکون چھین رہا ہے۔ اسے ان کتوں سے نفرت تھی۔ وہ ہوا میں اپنا چابک سرسراٹا تھا اور انہیں بھی اکساتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے سے کتے، غراتی بلیاں، قلابے کھا جاتے تھے۔ تیسرا، چوتھا، کبھی کبھی دسواں کوڑا ان کی گردن پر جا کر پڑتا تھا۔ پھر وہ گھوڑے کو آگے بھگاتا اور سڑک پر غبار سی چھا جاتی۔ شام ہونے پر لوگ کتوں کو سڑک سے اٹھا کر لاتے جب انہیں یقین ہو جاتا تھا کہ وہ گھڑسوار اب یہاں موجود نہیں ہے۔ ان کے پیٹ دھوپ میں چمکتے۔ نمی سے پھولے ہوئے، مردہ، ان کی آنکھوں اور تھوٹھوں پر کھیتوں کا قبضہ ہوتا۔ بڑے کسانوں کو وہ محکمہ سرائی کے حوالے کرتا تھا پھر متوسط کسانوں کو اور اس کے بعد چھوٹے کسانوں کو۔ بڑا محنتی تھا۔ آہستہ آہستہ بہت سارے اور بہت غریب ہو گئے۔ شہر میں مقیم مالک ان میں سے کچھ کو اگلی گاڑی سے گاؤں واپس پلٹا دیتے تھے۔

ایک صبح سفید گھوڑا ااصطبل میں مرا پڑا تھا۔ کسی نے بھوسے میں زہر افشانی کی تھی۔

□□□

اللہ کے نام پر پڑھ لے بابا



محبوب حسن

شعبہ اردو، بی ایچ یو، دارالاسی

موبائل: 8381856066

لگیں۔ رات کافی ڈھل چکی تھی۔ چاروں طرف خاموشی اور سناٹے کا گہرا سما یہ پورا تھا۔ اندر باہر ہر جگہ گھپ اندھیرے کا قبضہ تھا۔ کمرے میں چاروں طرف کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ اوپر نیچے دائیں بائیں چہار سو کتابیں ہی کتابیں۔ جیسے میں کتابوں کی قبر میں زبردستی گھس آیا ہوں۔ اس ماحول میں کبھی کبھی ڈرجلی کی مانند سینے میں کوند جاتا۔

”اللہ کے نام پر پڑھ لے بابا“ کی متواتر صداؤں کے سبب میرے سینے میں تجسس اور ڈر کی کوئی پھول پھوٹنے لگیں۔ بار بار یہ خیال آتا جاتا رہا کہ اے خدا!! اتنی رات گئے کون فریاد کتناں ہے؟ ”اللہ کے نام پر دے دے بابا“ کے فقرے مزاروں پر بار بار سن چکا لیکن یہاں معاملہ بالکل مختلف تھا اس لیے باہر کسی فقیر کے ہونے کا گمان بھی نہ ہوا۔ پھر ایک ایک کتب خانے کے ایک مخصوص کونے سے یہ صدا میں اٹھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میں نے فوراً کتابوں کا گھبرا لٹنا پلٹنا شروع کیا۔ گھبر کے نیچے زیادہ تخلیقی کتابیں خاص طور پر شعری مجموعے اور ناول دے ہوئے تھے۔ یہ کتابیں بوسیدگی کی چادر میں لپیٹی ہوئی تھیں۔ کچھ کتابیں خوش قسمتی سے محفوظ رکھنے کا روپ دھارن کر چکی تھیں۔ روز قیامت انسانی اعضاء کے گواہی دینے کی بات تو سننی تھی لیکن کتابوں کا نالہ و فریاد حاشیہ خیال میں بھی نہ آیا تھا۔ بے چاری مظلوم کتابوں کی حالت زار سے اپنا دل بھی ٹنگین ہوا اٹھا۔ فریاد کتناں شعری مجموعوں اور ناولوں کے صفحات پلٹنے

تھی۔ سوچ آن کرتے ہی پورا کمرہ روشنی میں نہانے لگا۔ کمرے میں عجب نظارہ تھا۔ چاروں طرف دیمک کی یلغار جاری تھی۔ رنگ برنگے، بالغ نابالغ ہر طرح کی دیمک کودتے پھاندتے نظر آنے لگیں۔ یکا یک دل میں یہ خیال آیا کہ ہم انسانوں سے بہتر یہ مخلوق ہے جو اپنی نیند حرام کر کے اپنے فرائض بحسن و خوبی انجام

شدت نیند سے آنکھیں خمار آلود ہوئی جاتی تھیں لہذا کتب خانے کا بلب بجھاتے ہی میں جھٹ سے بستر پر دراز ہوا۔ پلک جھپکنے ہی ذرا سی دیر کے بعد چپیں چپیں ہیں ہیں کی آوازیں سماعت سے ٹکرانے لگیں۔ یوں تو ان آوازوں میں موسیقیت و نغمگی بھی تھی لیکن بے خوابی کے باعث طبیعت پر گراں گزر رہی تھی۔ سوچ آن کرتے ہی پورا کمرہ روشنی میں نہانے لگا۔ کمرے میں عجب نظارہ تھا۔ چاروں طرف دیمک کی یلغار جاری تھی۔ رنگ برنگے، بالغ نابالغ ہر طرح کی دیمک کودتے پھاندتے نظر آنے لگیں۔ یکا یک دل میں یہ خیال آیا کہ ہم انسانوں سے بہتر یہ مخلوق ہے جو اپنی نیند حرام کر کے اپنے فرائض بحسن و خوبی انجام دے رہی ہے۔

دے رہی ہے۔ اس لیے انھیں چھینڑنا کسی بھی طرح مناسب نہ لگا۔ اس لیے میں نے فوراً بلب بجھا دیا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی ادکاری میں مصروف ہو گیا۔ تقریباً کوئی آدھے گھنٹے بعد ”اللہ کے نام پر پڑھ لے بابا“ کی دوسری مترنم آوازیں متواتر سنائی پڑنے

نیت میں کرتا ہوں حال دل سنانے کی، جس میں میرا کوئی ذاتی مفاد نہیں۔ زمانہ میری باتوں پر یقین کرے، نہ کمرے مجھے اس کی بالکل پروا نہیں۔ فکر اس بات کی ضرور ہے کہ دل کی رازدارانہ بات دیانت داری سے کہہ سکوں۔ گزشتہ مہینے اپنے ایک دوست کے ہاں اچانک بن بلائے مہمان کی طرح جا چکا۔ چارونا چارنا نہیں میری خاطر داری بھی کرنی پڑی۔ میرے لاکھ منج کرنے پر کہ میں مہینے کے آخری جمعرات کو گوشت نہیں کھاتا، حضرت کہیں سے دیسی مرغ ڈھونڈ لائے۔ پھر رہی تھی قسم بھی توڑنی پڑی۔ ڈنڈ کارنے کے بعد رات دیر تک محفل شکوہ جمی رہی۔ دماغ کے کونے کونے میں میل کی طرح جمی ہوئی باتیں کھرچ کھرچ کر نکالی گئیں۔ حضرت کی بیگم صاحبہ اس شمع محفل میں مسلسل تیل ڈالتی رہیں۔ جب شمع کی لو پھڑ پھرانے لگی تو ہم نے اجتماعی طور پر استغفر اللہ پڑھتے ہوئے اپنے گناہوں سے توبہ کی۔ ان کے ہاں ایک ہی کمرہ ہے، جس میں موصوف نے اپنی اہلیہ کے ہمراہ عرصے سے قبضہ جما رکھا ہے۔ لہذا مجھے ان کے کتب خانے میں پناہ نصیب ہوئی۔

شدت نیند سے آنکھیں خمار آلود ہوئی جاتی تھیں لہذا کتب خانے کا بلب بجھاتے ہی میں جھٹ سے بستر پر دراز ہوا۔ پلک جھپکنے ہی ذرا سی دیر کے بعد چپیں چپیں ہیں ہیں کی آوازیں سماعت سے ٹکرانے لگیں۔ یوں تو ان آوازوں میں موسیقیت و نغمگی بھی تھی لیکن بے خوابی کے باعث طبیعت پر گراں گزر رہی

پراس راز سے آشنائی ہوئی کہ سسکنے والی یہ کتابیں دراصل بصد خلوص و محبت تحفے میں پیش کی گئی تھیں۔ ان کتابوں کے زیادہ تر حصے دیمکوں نے دلجمعی سے چاٹ لیے تھے۔ دیمکوں کے اس حسن عمل سے ان کی پسند اور ناپسند سے واقفیت ہم پہنچی۔ اندازہ ہوا کہ دیمکوں کو تحقیقی و تنقیدی کتابیں بے لطف اور بے لذت لگتی ہیں۔ اسی لئے وہ اپنے لہجے / ڈنر میں تخلیقی کتابوں کو ہی مرغوب رکھتی ہیں۔ اس رات میں ایک پل بھی سونہ سکا۔ سردی کی یہ کپکپاتی رات پسینے سے شرابور رہی۔ بے خوابی اور فکر گراں کے سبب میری آنکھیں بری طرح سوچ گئی تھیں۔ دیمکوں کی ہیں ہیں، روح پرور خوشبو، کتابوں کی فریاد اور بے خوابی کی آمیزش نے مرغ ناگہاں کے لطف و کرم کو بے نور کر دیا۔ اس جگر سوز واقعہ کے کئی مہینوں تک میرے اندر ہی اندر آگ سلگتی رہی اور دھواں اٹھتا رہا۔ صبح ان کی بیگم نے بتایا کہ کسی مہمان کے آجانے پر مہینے میں ایک آدھ بارہی یہ سم سم دروازہ کھلتا ہے۔ اس نصیحت آمیز رات کی طوالت مہینوں تک فکر و خیال کے نئے نئے دائرے بناتی رہی۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ ادیب کیوں کر اداس نظر آتے ہیں؟ اور کیوں کردل میں تھکی تھکی سی تمنا لیے سانس لینے پر مجبور ہیں۔

گزشتہ دنوں خاکسار بنارس سے الہ آباد کا سفر طے کر کے کسی دوروزہ انٹرنیشنل سیمینار میں شریک ہوا۔ اس طویل مسافت کو کاٹنے میں کل پانچ گھنٹے صرف ہوئے۔ اس سیمینار میں ملک بھر سے مقالہ نگار حضرات جمع ہوئے تھے۔ ان مہمان اردو میں کچھ جانے پہچانے چہرے بھی نکلے۔ بعض صاحبان مجھے دیکھ کر چونک پڑے کیوں کہ دعوت نامے کے حاشیے میں بھی میرا نام نہ تھا۔ میں تو صرف ایک سامع کی حیثیت سے حاضر ہوا تھا۔ ایک صاحب حیرت انگیز لہجے میں گویا ہوئے کہ ”واہ بھئی واہ! کیا آپ سچ سچ مقالہ سننے آئے ہیں؟ میں نے تو آج تک آپ جیسا عاشق اردو نہیں

دیکھا۔“ اپنی بات دہراتے ہوئے میں نے پھر سے کہا کہ ”ہاں صاحب میں تو صرف مقالہ سننے آیا ہوں اور اس میں ایسی بھی حیرت کی کیا بات ہے؟ لیکن انھیں میری باتوں پر ذرہ برابر بھی یقین نہ آیا۔

حسب موقع ایک اور واقعہ میرے ذہن میں اُچھل کود مچانے لگا ہے۔ ہاں تو قصہ کچھ یوں ہے کہ ابھی پچھلے برس فروری کے مہینے میں خاکسار اپنے بھانجے کے ختنہ کی تقریب میں شامل ہوا تھا۔ بھانجے محلے کی دکان سے چورن خرید کر پھانک رہے تھے۔

صحن میں چورن کے کاغذ جہاں تہاں بکھرے پڑے تھے۔ رات کی تاریکی صحن میں پاؤں پسا رہ چکی تھی لہذا دور سے کچھ بھی صاف صاف دکھائی نہ پڑتا تھا۔ لیکن جب مجھے ان کاغذات میں اردو کے حروف ہونے کا اندازہ ہوا تو پاس جا کر ایک کلکلا اٹھا لایا۔ بلب کی تیز روشنی میں کاغذ کے کلکڑے کو دیکھتے ہی میں ہکا بکارہ گیا۔ افسوس!! صد افسوس!! کہ ادب اطفال پر مشتمل خاکسار کی کتاب ”دنتلی رانی“ کی عزت و عظمت ایک بیٹے کی دکان پر تار تار ہو رہی تھی۔

مسرت اس بات کی ضرورت تھی کہ ”دنتلی رانی“ نے گل و خار کے فاصلے مٹا دیے تھے۔ لیکن خوشی کے ساتھ ساتھ ملال ہوتا رہا۔ پرچون کی دکان تک ”دنتلی رانی“ کا یہ سفر خود میں کسی کی رسوائی کا سامان چھپائے ہوئے ہے لہذا مجھ میں ان راز ہائے سر بستہ کو کھولنے کی سکت نہیں۔

سیمینار کے اختتام کے بعد میں جلدی جلدی ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ حسب معمول ترین اپنے مقررہ وقت سے دو گھنٹے تاخیر سے آنے والی تھی لہذا میں پلیٹ فارم پر

واقعہ ویننگ روم میں جا گھسا۔ کنارے کی ایک کرسی پر بیٹھے بیٹھے میں خیال یار میں گم تھا کہ اچانک میری نظر کونے میں پڑے پلاسٹک کے ایک لاوارث تھیلے پر پڑی۔ پولیس والوں کو مطلع کرنے سے قبل میں نے پاس جا کر دیکھا تو حیرت سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس تھیلے میں اردو کی کتابیں احساس بے بسی سے باہر جھانک رہی تھیں۔ میں نے تھیلہ اٹھوا تو اس میں ایک ناول اور چار شعرے مجموعے منھ لڑکائے مجھے بے بس نگاہوں سے تاک رہے تھے۔ یہ کتابیں ایک ایسی اردو نواز ہستی کو تحفہ پیش کی گئیں تھیں، جو غم اردو میں جہاں تہاں روتے بلہلاتے نظر آتے ہیں۔

حسب موقع ایک اور واقعہ میرے ذہن میں اُچھل کود مچانے لگا ہے۔ ہاں تو قصہ کچھ یوں ہے کہ ابھی پچھلے برس فروری کے مہینے میں خاکسار اپنے بھانجے کے ختنہ کی تقریب میں شامل ہوا تھا۔ بھانجے محلے کی دکان سے چورن خرید کر پھانک رہے تھے۔ صحن میں چورن کے کاغذ جہاں تہاں بکھرے پڑے تھے۔ رات کی تاریکی صحن میں پاؤں پسا رہ چکی تھی لہذا دور سے کچھ بھی صاف صاف دکھائی نہ پڑتا تھا۔ لیکن جب مجھے ان کاغذات میں اردو کے حروف ہونے کا اندازہ ہوا تو پاس جا کر ایک کلکلا اٹھا لایا۔ بلب کی تیز روشنی میں کاغذ کے کلکڑے کو دیکھتے ہی میں ہکا بکارہ گیا۔ افسوس!! صد افسوس!! کہ ادب اطفال پر مشتمل خاکسار کی کتاب ”دنتلی رانی“ کی عزت و عظمت ایک بیٹے کی دکان پر تار تار ہو رہی تھی۔ مسرت اس بات کی ضرورت تھی کہ ”دنتلی رانی“ نے گل و خار کے فاصلے مٹا دیے تھے۔ لیکن خوشی کے ساتھ ساتھ ملال ہوتا رہا۔ پرچون کی دکان تک ”دنتلی رانی“ کا یہ سفر خود میں کسی کی رسوائی کا سامان چھپائے ہوئے ہے لہذا مجھ میں ان راز ہائے سر بستہ کو کھولنے کی سکت نہیں۔

شکر خداوندی کہ کتابیں دھڑا دھڑا کسی طوفانی بارش کی طرح شائع ہو رہی ہیں۔ ہر شخص بغل میں اپنی

کتابوں کا قبرستان میں بن کر رہ گئی ہے۔ سناٹے کا ستم ایسا کہ دن کے اجالے میں ہی وہاں ڈر جانا کچھ ناممکن نہیں۔ کتب خانے کی پر رونق فضا بیوگی کی نذر ہو گئی ہے۔ قارئین کی بے اعتنائی کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ اردو کی کتابوں پر جی ہوئی دھول کی موٹی پرت کتابوں کو موسم کے سرد گرم سے محفوظ رکھتی ہے۔ ابھی حالیہ دنوں دہلی کے پرگتی میدان میں بین الاقوامی کتاب میلے کا انعقاد ہوا تھا۔ اس میلے میں ہندو پاک کے متعدد اردو پبلشرز امیددہم کا قطب مینار لیے جمع ہوئے۔ لیکن خستہ حالی ایسی کہ ان کی امیدوں کا قطب مینار مایوسی کا ہمالیہ میں تبدیل ہو گیا۔ ان کے سینے میں مچلنے والی حسرتوں کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ ان کی پر نور آنکھیں محبان اردو کے انتظار میں پتھر اگئیں۔ بقول فیض:

ویراں ہے میکدہ، خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے
خدا سچ بولنے کی توفیق دے!! کتابوں سے
محبت کا ایک وہ دور تھا جب دو تیززائیں کلیات مجاز کو تکیے
کے نیچے چھپائے اپنی جھیل سی آنکھوں سے آنسو بہاتی
تھیں۔ کاش وہ زمانہ واپس آجائے جب ڈرامہ ”انارکلی“
”چوری ہو جانے پر بلبل جو نیورس کی بیگم صاحبہ عالم غم
میں دوپہر سے شام تک بے ہوش رہیں۔ ریشمی
زنجیروں میں جکڑے ہوئے میرے ہم پیالہ ہم نوالہ
دوست نے آبدیدہ ہوتے ہوئے بتایا کہ میری مالکن
کتابوں کو سوتن سمجھتی ہیں۔ بے جان کتابوں کو کوسنے میں
ہی ان کے شب و روز گزر جاتے ہیں۔ حضرت اپنی
لاہری کی کچی زیر دہشت ہمیشہ ہی پاجامے کے
ناڑے سے باندھ کر رکھتے ہیں کہ کہیں بیگم کے تہر کا
نزول نہ ہو جائے!! اے پروردگار تو کتب خانہ کو عجائب
خانہ ہونے سے بچالے تاکہ دیکھ رات میں خراٹے
لیں اور کسی کے پاجامے پر اضافی بو جھنڈ پڑ سکے!!

□□□

◆ نیادور دسمبر ۲۰۱۷ء ۸۱

کیا جائے گا۔

جی صاحبو! لاہری میں قید و بند کی سزا کاٹ رہی اردو کتابیں ضمانت پر رہا ہونے کے لیے ترستی

اودھ نمبر کتابی شکل میں



’نیادور‘ نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک ’اودھ نمبر‘ بھی ہے جسے دو حصوں میں شائع کیا گیا تھا۔ اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اردو ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیادور سے براہ راست یا بذریعہ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰ روپے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰ روپے ملا کر کل قیمت ۲۵۰ روپے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ نیادور

ہیں۔ ہر پل ہر لمحہ ہجر و فراق کی تپش سے گھلنے والی اردو کتابوں کا رنگ زرد مائل ہو گیا ہے۔ مرحوم خدا بخش خان کی قائم کردہ شہرہ آفاق ’خدا بخش لاہری‘

دو چار کتابیں دبائے پھر رہا ہے۔ مقام فکر ہے کہ غالب جیسا دیو قامت شاعر اپنے دیوان کی اشاعت کے لیے عرصہ دراز تک ترستا رہا لیکن آج دریائے رحمت سراپا مہربان ہے۔ آج ہوا میں پتھر پھینکتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ کسی اردو ادیب کو نہ لگ جائے!! لیکن دوسری جانب اردو قارئین کا حد درجہ قحط ہے۔ کتابوں کو کوئی سو گھننے والا بھی نہیں۔ اردو کے اولین ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد اپنی صاحبزادیوں کی ذہنی تربیت کے مقصد سے قصے/کہانیاں لکھتے تھے۔ لیکن آج کا مفلوک الحال ادیب صرف اپنی ذات واحد کے لیے ہی روشنائی بہا رہا ہے کیوں کہ اردو سے نابلد اس کی اپنی اولادیں بھی اسے گھاس نہیں ڈالتیں۔ شب و روز کا یہ سلسلہ حیرت و افسوس کی نت نئی تصویریں بناتا جا رہا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب ادباء و شعراء قرآن خوانی کی طرز پر ناول خوانی اور شعر خوانی کا اہتمام کریں گے۔ یہ تقریب خون پسینی کی کمانی ہوئی اپنی رزق حلال سے منعقد ہوگی یا عین ممکن ہے کہ سرکاری اداروں کے مہر و وفا کے دروازے اور کھڑکیاں کھل جائیں۔ اس کے لیے اخباروں میں اشتہارات شائع کرائے جائیں گے۔ علاوہ ازیں بازاروں اور گلی کوچوں میں لاڈ ڈاڈا پیکر سے بھی اعلان کرایا جائے گا۔ حضرات! حضرات! حضرات! ایک ضروری اعلان۔ اس مہینے کی ۲۱/ تاریخ بروز سنیچر کو شہنشاہ فکشن کے بیگلے پر بعد نماز ظہر ناول خوانی کے ایک عظیم الشان جلسے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ محبان اردو سے مخلصانہ گزارش ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہو کر موصوف کو جیتے جی ایصال ثواب کریں۔ حضرات! حضرات! حضرات! دوسری اہم بات یہ کہ ناول خوانی کی اس مجلس میں ظہرانہ اور عشائریہ کا بھی معقول انتظام کیا جائے گا۔ دور دراز کے علاقوں سے تشریف لانے والے عاشقان اردو کو کرائے کی رقم بھی ادا کی جائے گی۔ یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالرز اور طلباء و طالبات کے لیے خصوصی انتظام



نجیب انصاری

ایس ایس سی-57، سیکٹر-سی، کرسی روڈ، لکھنؤ

موبائل: 9450604369

کسانوں کو قرض سے نجات

تصدیق کرنا اس کی سفارش کے بعد قرض اکاؤنٹس میں براہ راست ادائیگی کی جائے گی۔

www.upkisanankarjrahat.upsdc.gov.in

(کسان امدادی پورٹل) پر اپنا آدھار نمبر ڈال کر اپنی پوزیشن معلوم کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ضلع مجسٹریٹ کے دفتر میں قائم کنٹرول روم کے فون نمبر پر اپنا معاملہ درج کر سکتے ہیں۔ ضلع سطح کی کمیٹی کے ذریعہ اہل نہ پائے جانے پر منطقی کمشنر کی سربراہی والی کمیٹی کو درخواست دی جاسکتی ہے۔

اتر پردیش کے کسانوں کی اوسط ماہانہ آمدنی محض ۴۹۲۳ روپے ہے جو کہ قومی اوسط آمدنی ۶۲۲۶ روپے ماہانہ سے کافی کم ہے اور پنجاب کے کسانوں کی اوسط ماہانہ آمدنی ۱۸۰۵۹ روپے کا ایک تہائی ہے۔ اتر پردیش میں اوسط ماہانہ خرچ ۶۲۳۰ روپے ہے جس کے نتیجے میں ریاست کا کسان ہر ماہ ۱۳۰۷ روپے کے خسارے میں جا رہا ہے۔ ان حالات کو سدھارنے کی کوشش میں اتر پردیش کی حکومت کئی قدم اٹھا رہی ہے۔ جیسے پیداواریت کو سدھارنے کے لئے سائنسی طریقوں کو اپنانا، فصل کٹائی کے بعد کے نقصانات کو کم کرنا، ہنرمندی اور بنیادی سہولتوں کا فروغ، زراعت اور نوڈ پروسیسنگ کی حوصلہ افزائی وغیرہ۔ ان کوششوں کے سلسلے میں اور کسانوں کو وقت سے راحت دینے کے مقصد اتر پردیش نے چھوٹے اور مارجنل کسانوں کی ترقی نیز متواتر فروغ کے لئے ایک قرض چھڑکارا اسکیم نافذ کی ہے۔ یہ اسکیم درحقیقت چھوٹے اور

ریاستی حکومت کی جانب سے چھوٹے اور مارجنل کسانوں کو راحت دینے اور ان کی ترقی کے لئے فصل قرض چھڑکارا اسکیم نافذ کرنے کا تاریخ ساز فیصلہ کیا گیا، جس کے تحت کسانوں کی ضروری صلاحیت میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ اس کا مقصد ایک مجموعی لائحہ عمل تیار کر کے زراعت کے زمرے کی ہمہ جہت ترقی کر کے کسانوں کی آمدنی میں اضافہ کرنا ہے۔

ریاستی حکومت چھوٹے اور مارجنل کسانوں کے مورخہ ۳۱ مارچ ۲۰۱۶ء تک لئے گئے فصلی قرضوں کے برعکس مالیاتی سال ۱۷-۲۰۱۶ء میں ان کے ذریعہ کی گئی ادائیگی کو ایڈجسٹ کرنے کے بعد بقیہ قرض کی رقم سے ایک لاکھ روپے کی حد تک نجات دلانے کے لئے پابند عہد ہے۔ اس اسکیم میں ایسے کسانوں کو ترجیح دی جائے گی جنہوں نے اپنے فصلی قرض اکاؤنٹ کو آدھار کارڈ سے لنک کر لیا ہے۔ اکاؤنٹس کے آدھار کارڈ سے لنک ہو جانے کے بعد ضلع کمیٹی کی سفارش کے بعد مستفیدین کے قرض اکاؤنٹس میں براہ راست ادائیگی کی جائے گی۔

جن کسانوں کے بینک فصلی قرض اکاؤنٹس پہلے مرحلے میں آدھار کارڈ سے لنک نہیں ہوئے ہیں، وہ کسان بینک کی متعلقہ برانچ میں جا کر اپنے اکاؤنٹ کو آدھار کارڈ سے لنک کرالیں۔ اس کے بعد دوسرے مرحلے میں ضلع سطح کی کمیٹی کی سفارش کے بعد ادائیگی براہ راست مستفیدین کے قرض اکاؤنٹ میں کی جائے گی۔ بقیہ معاملوں میں ضلع سطح کی کمیٹی سے

اتر پردیش کی تقریباً ۷۰ فیصد آبادی براہ راست یا بالواسطہ طور پر زراعت اور متعلقہ کاموں پر منحصر ہے۔ اس کے باوجود ریاست کے کسان اقتصادی طور پر پیچید کمزور ہیں جیسا کہ اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ کسانوں کی آمدنی کے نظریے سے ۱۸ اہم ریاستوں میں اتر پردیش کا ۱۳واں مقام ہے۔

ریاست میں کل جوت کی تعداد تقریباً دو کروڑ ۳۳ لاکھ ہے جس میں چھوٹے اور مارجنل کسانوں کی جوت تقریباً ۲ کروڑ ۱۶ لاکھ ہے۔ ان کسانوں کی اقتصادی حالت بیدختہ ہے۔ وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی کی قیادت میں نئی حکومت نے عوامی بہبود کے عہد نامے میں کئے گئے وعدے کے مطابق زراعت کے زمرے کی ترقی اور کسانوں کی اقتصادی حالت میں بہتری کے لئے متعدد قدم اٹھائے ہیں۔ اس سمت میں کسانوں کے مفاد میں کئی بڑے فیصلے کرتے ہوئے ان پر عمل آوری بھی شروع کر دی گئی ہے۔

حکومت اتر پردیش نے اپنے پہلے بجٹ میں زراعت اور متعلقہ کاموں کے لئے ۶۷ ہزار ۶۸۲ کروڑ ۶۱ لاکھ روپے کا بندوبست کیا ہے جو گزشتہ سال کے بجٹ سے تقریباً دو گنا ہے۔ سہارا قیمت اسکیم کے تحت گیہوں کی سہارا قیمت ۱۶۲۵ روپے فی کوئٹل مقرر کی گئی۔ اس کے علاوہ لوڈنگ آن لوڈنگ کے لئے ۱۰ روپے فی کوئٹل کی الگ سے ادائیگی کی گئی۔ تقریباً ۷۳ لاکھ میٹرک ٹن گیہوں کی خرید کی گئی جو سال گزشتہ کے مقابلے میں تقریباً پانچ گنا ہے۔

لئے محکمہ زراعت نے کئی فصلی بیمہ کمپنیوں سے معاہدے کئے ہیں۔ اس کے علاوہ بندیل کھنڈ علاقہ کے کسانوں کی آبپاشی صلاحیت میں اضافہ کرنے کے لئے اب تک ۲۵۷۲ تالاب بنائے گئے۔ کسانوں کو دی جانے والی سبھی سہولتیں شفاف طریقے سے مہیا کرانے کے لئے آن لائن رجسٹریشن کرایا جا رہا ہے۔ کسانوں کو دی جانے والی ہر طرح کی چھوٹ ڈی بی ٹی کے ذریعہ سے کسانوں کے بینک کھاتے میں منتقل کی جا رہی ہے۔

محکمہ زراعت کی کوششوں سے ریاست میں ۱۲،۸۶ لاکھ کوئٹل اعلیٰ قسم کے مصدقہ بیج کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس میں سے ۹،۴۰ کوئٹل بیج کسانوں کو سبسڈی پر مہیا کرایا جائے گا۔ موجودہ ریج فصل سے کسانوں کو گیہوں اور جو کے مصدقہ بیج پر ۴۰۰ روپے فی کوئٹل کے بجائے ۶۰۰ روپے فی کوئٹل ریاستی حکومت کی جانب سے دئے جائیں گے۔ کسانوں کو دی جانے والی یہ ترقی یافتہ زرعی آلات خریدنے یا کرائے پر لینے کے لئے اور زرعی آلات کی مرمت وغیرہ کے مقصد سے ۳۵۷ فارم مشینری بینک اور ۹۸ کسٹم ہارنگ سینٹر قائم کئے جا رہے ہیں۔ ریاست میں سبھی کسانوں کو مٹی کی جانچ کے بعد صحت کارڈ مہیا کرانے کی کارروائی یقینی بنائی جا رہی ہے۔ کسانوں کے مفاد میں مویشی پروری اور ماہی پروری کو بھی فروغ دیا جا رہا ہے۔

□□□

کسان کی ملکیت کی مختلف آراضی کا کل رقبہ چھوٹے کسان کے لئے دو ہیکٹیر اور مارجنل کسانوں کے لئے ایک ہیکٹیر سے زیادہ نہیں ہونا چاہئے۔

ایسا کسان جس کے فصلی قرض کی ریزرو بینک کی گارنڈ لائن کے مطابق قدرتی آفات کے ہونے کی وجہ سے ازسر نو تشکیل کردی گئی ہو، اس اسکیم سے مستفید ہوگا۔

حکومت کی جانب سے ممکنہ مال کے رکاز کی بنیاد پر پٹے پر دی گئی آراضی پر پھینکی کرنے کے لئے کسان کے ذریعہ لیا گیا فصلی قرض۔

اس اسکیم کے علاوہ ریاستی حکومت کسانوں کی خوشحالی کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ آئندہ پانچ برسوں میں کسانوں کی آمدنی دوگنی کرنے کا ہدف مقرر کیا گیا ہے۔ کسانوں کو آبپاشی کے لئے ماحولیات سے ہم آہنگ اور سٹشی توانائی کے زیادہ سے زیادہ استعمال کی حوصلہ افزائی کے مقصد سے سستی اور آلودگی سے پاک آبپاشی کے لئے دس ہزار سولر فوٹو وولٹک سینچائی پمپ کی تنصیب کے کام کو اولین ترجیح دیتے ہوئے نافذ کیا گیا ہے۔ فصلوں کے نقصان کی بھر پائی کی رقم کسانوں کو وقت سے دستیاب کرانے کے لئے ریاست میں وزیر اعظم فصل بیمہ اسکیم کی عمل آوری کی جا رہی ہے۔ وزیر اعظم فصل بیمہ اسکیم کو زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے کے

مارجنل کسانوں کو تقویت دینے، ان کی پریشانیوں کو دور کرنے اور زراعت کو نئی توانائی دینے کے لئے اٹھایا جانے والا اہم قدم ہے۔

یہ اسکیم چھوٹے اور مارجنل کسانوں کی ضروری صلاحیت میں اضافہ کر رہی ہے نیز اس کا مقصد ایک ہمہ جہت لائحہ عمل تیار کرنا ہے تاکہ زراعت کے زمرے کے گونا گوں فروغ کے توسط سے کسانوں کی آمدنی میں اضافہ کیا جاسکے۔ اس کے علاوہ یہ اسکیم وزیر اعظم کے ۲۰۲۲ تک کسانوں کی آمدنی کو دوگنا کرنے کے وزن کو حاصل کرنے میں ایک مثبت قدم ہے۔ حکومت اتر پردیش ریاست کے سبھی چھوٹے اور مارجنل کسانوں کے مورخہ ۳۱ مارچ ۲۰۱۶ء تک لئے گئے فصلی قرضوں کے برعکس مالیاتی سال ۲۰۱۶-۱۷ء میں ان کی جانب سے کی گئی ادائیگی کو ایڈ جسٹ کرنے کے بعد باقی قرض کی رقم (ایک لاکھ روپے کی حد تک) سے انہیں نجات دلا رہی ہے۔ اس اسکیم کے توسط سے ریاستی حکومت نے ریاست کے ۸۶ لاکھ چھوٹے اور مارجنل کسانوں کا ۳۶ ہزار کروڑ روپے کا فصلی قرض معاف کیا۔

اسکیم سے مستفید ہونے کے شرائط

- اتر پردیش میں رہائش پذیر کسان جن کی زرعی آراضی اتر پردیش میں ہو اور انہوں نے اتر پردیش میں واقع بینک سے فصلی قرض لیا ہو۔

’نیا دور‘ کو ایسی ادبی تخلیقات کا شدت سے انتظار ہے جو نہ صرف دلچسپ بلکہ معلوماتی بھی ہوں۔ ایسی تخلیقات جو اعلیٰ درجے کے ادبی شہ پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں مگر عام قاری کی دلچسپی سے عاری ہوں تو اسے ’نیا دور‘ اپنی اشاعتی ترجیحات میں شامل کرنے سے گریز کرے گا کیونکہ معاملہ دراصل اردو کے فروغ کا ہے۔ اردو محض یونیورسٹیوں کے شعبوں، تحقیقی اداروں اور دیگر اردو مراکز تک اپنی مخصوص ضرورتوں کے تحت محدود رہے، اس روش سے بہر حال پرہیز کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ہم سب کا اولین فریضہ ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں پوری تہذیب کے ساتھ شامل رہیں اور عام قاری سے اردو کے مراسم کو استوار کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ تخلیق کا غیر مطبوعہ ہونا لازمی شرط ہے۔ تخلیق کے ساتھ اپنی تصویر، ٹکٹ لگا ہوا الفاظہ معہ پتہ اور بینک اکاؤنٹ نمبر، آئی۔ ایف۔ ایس۔ سی، برانچ کوڈ والا Cancelled Cheque بھی ضرور ارسال کریں۔ بغیر بینک تفصیلات کے حاصل ہونے والی تخلیقات کسی بھی صورت میں شائع نہیں کی جائیں گی کیونکہ اس کے سبب ہی دیگر تخلیق کاروں کے اعزاز یہ میں غیر ضروری تاخیر ہوتی ہے۔

نیادور ہندوستان کے بیشتر اہم شہروں کی ایجنسیوں پر دستیاب ہے۔ ایجنسیوں کی فہرست شائع کی جا رہی ہے۔

۱	محمد نعیم دانش محل، سنٹرل ہوٹل، مقابل زیر زمین پارکنگ، امین آباد، لکھنؤ۔ Mo. 9792361533
۲	مولانا محمد وسیل ندوی علامہ شبلی لائبریری، دارالعلوم ندوۃ العلماء ٹیگور مارگ، ڈالی نچ، لکھنؤ۔ 226007
۳	سید محمد سرور عرش ایسوسی ایٹس، خواجہ ٹاور، نزد وی مارٹ، وکٹوریہ اسٹریٹ، نئاس، لکھنؤ
۴	نظامی پریس نزد شجاع کالج، وکٹوریہ اسٹریٹ نئاس، لکھنؤ
۵	مولانا اسد سیف جاسمی نور ہدایت فاؤنڈیشن، امام باڑہ، غفر آئنا چوک، لکھنؤ۔ 8736009814
۶	ادارہ تنظیم الکتب ریڈنگ کلب بلڈنگ، جگت نارائن روڈ، گولہ نچ، لکھنؤ

ہندوستان کے دیگر شہروں کی ایجنسیاں

۱	جناب اسد یار خان ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکٹ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ 202002 موبائل۔ 96341 05087
۲	جناب طالب حسین ایف۔ ڈی۔ انٹر کالج، کالج دروازہ، مراد آباد۔ 244001، یو پی۔ موبائل۔ 098372 25809
۳	ڈاکٹر نہال رضا یوتھ فیلڈریشن، عسکری کلینک، محلہ قاضیانہ، پوسٹ روولی ضلع۔ فیض آباد۔ 224120 موبائل۔ 94151 52710
۴	جناب علی حسین ادیبی ادریس بک سینٹر، نیوز پیپر ایجنٹ، سنگت کلا، غازی پور۔ سٹی۔ 233001 یو پی موبائل۔ 93693 05266
۵	جناب محمد بدر الدین ناوٹی پریس، علامہ اقبال چوک قلعہ گھاٹ، درہنگہ۔ بہار۔ 846004
۶	جناب زکریا یاز ایم پی ایم نگر، اورئی، جالون موبائل۔ 9452452788
۷	جناب امیناز انور بک امپوریم، اروہ سبزی باغ پٹنہ۔ 800004 موبائل۔ 93048 88739
۸	جناب ضمیر احمد ضمیر بک ڈپو، قطب شیر، سہارنپور۔ یو پی 098971 08075
۹	جناب روشن صدیقی ناصر لائبریری، ابو بازار اونچا۔ گورکھپور۔ (U.P.) 273001 9451846364
۱۰	ڈاکٹر شکیل احمد قاسم منزل، ڈومن پورا، چنگی مونا تھ۔ بجن۔ 275101 - Mo. 92367 22570
۱۱	جناب ایس۔ ایم۔ عباس ایڈوکیٹ ۸۸، تارملہ، جوپور۔ 222001 - Mo. 98380 81405
۱۲	جناب بھوئی پرساد گپتا، ویدھ سابق نام نگار، ترون بھارت اترولہ، بلرا میور (U.P.) 271604
۱۳	میسرس کمالیہ بک ڈپو تاتار پور، بھالگپور۔ بہار۔ 812002 Mo. 93341 90757
۱۴	جناب کامل مجید محلہ چاہ میر، مقابل نواب دوپے کی کوٹھی، بدایوں Mo. 94102 93406
۱۵	جناب سانغوارٹی امین زئی، جلا پور، شاہجہانپور Mo. 93691 90785
۱۶	میسرس انیس بک ڈپو ۷/۱ محلہ۔ آٹالہ، الہ آباد۔ Mo. 93351 68463
۱۷	جناب عباد احمد ایڈوکیٹ جج صاحب کا پھانگ، مولوی تولہ فانی روڈ، بدایوں۔ 243601 Mo. 94124 08110
۱۸	عارف علی بک سیکر لطیف مارکٹ، خیر آباد ضلع سینا پور۔ (U.P.) 261131 Mo. 93363 04064
۱۹	جناب ایس۔ ع۔ ازدار حسین نقوی ۶۰/۲۵، حضرت گنج، دور یا یاد الہ آباد (U.P.) 211003 Mo. 99198 16295
۲۰	میسرس پوجا پبلیکیشن بھنڈار سرائے میر، اعظم گڑھ۔ 276305 Mo. 94510 39177
۲۱	میسرس ہدم بک اسٹال، مہارک پور اعظم گڑھ، 92362 72662
۲۲	جناب محمد سلیم (جنرلسٹ) پیر بناون (پھلواری)، بارہ بنکی Mo. 94157 74724
۲۳	میسرس نظامی بک ایجنسی (نظامی پریس) محلہ۔ سویتھا، بنگلی بدایوں روڈ، بدایوں Mo. 93583 57370

۲۴	جناب محفوظ الرحمن کنسٹرکشن ڈویژن - اے پی - ڈبلیو - ڈی، ہر دوی Mo . 9451916715	۳۴	جناب ندیم اختر جن سبواکینڈر، پوسٹ - گنج ڈنڈوارہ ضلع - کاس گنج، (U.P) 207242	۲۲	میسرس عامر کتاب سینٹر ۳۳۳۲ - گنج، کئی نمبر - ۶، بانلہ ہاؤس جامعہ نگر نئی دہلی - 110025 Mo. 098110 29831
۲۵	جناب اظہار ندیم عرشہ پبلیکیشن، اے - ۱۷۰ گراؤنڈ فلور، ۳ - سوریا پارٹمنٹ، دلشاد کالونی، نئی دہلی - Mo 9971775969	۳۵	میسرس خوشتر کتاب گھر پوسٹ، ہنور، سدھارتھ نگر - 272191 Mo. 94156 69624	۲۵	میسرس قریشی نیوز ایجنسی جی - بی - ایچ - مین روڈ، راؤ کیلا، اڑیسہ - 760001 Mo. 94394 99458
۲۶	میسرس سکندر نیوز ڈسٹری بیوٹریز سپلائر، لال چوک، شہری نگر، جے اینڈ کے Mo. 9797797124	۳۶	نورینی بک سٹور اینڈ نیوز پیپر ایجنٹ سی - کے - ۱۰۱/۲۲، وال منڈی وارانسی - (U.P) 221001 Mo-94153 55954	۲۶	میسرس صالحہ بک ٹریڈیرس اینڈ اسٹیشنر جامع مسجد، مومن پورا ناگ پور، مہاراشٹر - 440018 Mo. 07122 721069
۲۷	میسرس کوثر اجپنسی ریاض خان، معرفت اکولہ پان جینڈر پان مارکٹ، جنتا بازار، اکولہ - 444001 Mo. 098221 25888	۳۷	جناب شہاب حسین 'جرنلسٹ' محلہ ناظر پورہ، بہرائچ - 271801 Mo- 94523 11999	۲۷	میسرس راعین بک ڈپو ۳۳۷، کٹھہ، الہ آباد، (U.P)، 211003 Mo. 99365 16895
۲۸	ماسٹر محمد سلیم شبیخ اول پور، پوسٹ ڈنڈوارہ - ضلع کاس گنج Mo. 9557996293	۳۸	جناب محمد شوکت علی بک اسٹال ۲۱/اے، ایچ - ایم - ایم اسکوائر نزد مسلم انسٹی ٹیوٹ، کولکاتا - مغربی بنگال	۲۸	جناب بصیر الدین سکرٹری غالب لائبریری، ۶، غالب نگر فیروز آباد، (U.P) 283203 Mo.94562 39242
۲۹	جناب سالم رضوی معرفت عثمانی بک ڈپو ۱۲۵، رینڈر اسرائے، کولکاتا Mo. 09433050634	۳۹	جناب خالد قیصر محلہ سریان، پوسٹ محمدی - ضلع لکھنپور (U.P) 262804 Mobile .94155 62853	۲۹	ڈاکٹر وجہ القمص لقی جے - کے کالونی، لولی پور، حنیف نگر لولی پور سلطانپور (U.P) 228001 Mo.94515 58318
۵۰	جناب محبوب علی محلہ - چکی ٹولہ، پوسٹ لہر پور، سیتاپور Mo. 9559347469	۴۰	میسرس جبلی بک سینٹر ۱۱۹/۱۰۵، جبلی کالج روڈ چن گنج، کانپور (U.P) 208001 Mo. 09336720718	۳۰	جناب تنویر تنویر بک ڈپو، جی - بی - ٹی - روڈ آسن سول، مغربی بنگال - 713301 Mo. 98321 14440
۵۱	جناب حاجی نثار احمد شعبہ اردو، حیدرآباد یونیورسٹی، سینٹرل یونیورسٹی، پروفیسری آر راؤ روڈ حیدرآباد - 500046 Mo. 09391062713	۴۱	میسرس سحر بک ایجنسی وشیتہ عریک کالج، رائے جوہلی، ضلع فیض آباد - (U.P) 224001 Mo.95653 83714	۳۱	میسرس کتاب دار پبلیکیشنس ۱۱۰ - ۱۰۸، جلال منزل ٹمکرا سٹریٹ، ممبئی، 7400008
۵۲	جناب اشرف الحق انصاری اشرف نیوز ایجنسی، وارث پورا، کانبھٹی، ناگپور Mo. 08956697056	۴۲	جناب خعیب حسن کمرہ نمبر ۲۲۳، جامعہ سلفیہ، ریوری تالاب بی - اے - ۱۸، جی، وارانسی - 221010 Mo . 95576 3570014	۳۲	خالہ لائبریری نزد مسلم فنڈ ٹرسٹ، دیوبند، سہارنپور Mo.92863 64999
۵۵	مکتبہ جامعہ اردو بازار، جامع مسجد، نئی دہلی - ۶	۴۳	جناب ایس - پرویز میسرس ہورانژن ڈسٹری بیوٹر ۱۳ - بی - گورا چاند روڈ، کولکاتا - 700014 Mo. 9831311918	۳۳	میسرس ایم - ایچ بک سیلر ہول سیلر اینڈ ریٹیلر، محلہ رحم گنج درجنگلہ - 846004 Mo. 094314 58429
۵۶	جناب شفیق الرحمن 170/1، گنگا دھار، KDA کالونی، جانگ منو، کانپور موبائل: 9415482499				
۵۷	ابراہیم شاکر گورکھپوری الہی باغ نزد چھوٹی مسجد، گورکھپور موبائل: 9695122448				

نیادور کی ایجنسی صرف دس شماروں کی ایڈوانس رقم ڈرافٹ کے ذریعہ بھیج کر حاصل کی جاسکتی ہے۔ ایجنسیوں ۴۰ فیصد کمیشن کی حقدار ہوں گی۔

آپ کے خطوط

ایک عرصے بعد نیا دور نظر نواز ہوا۔ یاد آوری کا شکر یہ۔ نیا دور کا نیا انداز پیشکش پسند آیا۔ مشمولات کی رنگارنگی ذوق مطالعہ کی تسکین کا باعث ہے۔ اس سے قبل کے شمارے مجھے نہیں ملے۔ یہاں ڈاک کا نظام بے حد ناقص ہے۔ اگر ممکن ہو سکے تو پرچے اسپید پوسٹ سے روانہ کیجئے۔ حسب فرمائش بہت جلد افسانہ بھیج رہا ہوں۔ شاد و آباد رہیں۔

سلام بن رزاق

میرا روڈ، تھانے (مہاراشٹر) بذریعہ واٹس اپ

آپ نے ماہنامہ ”نیا دور“ کی ادارت کیا سنبھالی کہ انقلاب ہی برپا کر دیا۔ ہر ماہ پابندی سے رسالہ نہ صرف شائع ہو رہا ہے بلکہ بذریعہ کوریئر قارئین تک پہنچ بھی رہا ہے۔ میرے پیش نظر نومبر ۲۰۱۷ء کا شمارہ ہے۔ منور رانانے رام نایک کی آپ بیتی کا اردو ترجمہ ”چلتے رہو چلتے رہو“ کا مختصر لیکن عمدہ جائزہ لیا ہے۔ ۲۰۱۷ء کے ادب کے نوبل انعام یافتہ کارڈواشی گورو سے متعلق خورشیدا احمد صاحب کے مضمون سے بہت کچھ جاننے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ آپ نے مختصر ائی سہی ۲۰۰۱ء سے ۲۰۱۶ء کے ادب کے نوبل انعام یافتگان کی نہ صرف تصاویر

شائع کی بلکہ ان کے ناول / شاعری کے محرکات پر جس ژرف نگاہی کا ثبوت پیش کیا ہے واقعی قابل مبارکباد ہیں۔ ف۔س۔ ایجاز صاحب کا مضمون ”کھاسی زبان اور اس کی مشہور لوک کہانیاں“ کافی محنت سے لکھا گیا ہے۔ ”گوشہ لکھنؤ“ عنوان کے تحت مرزا جعفر حسین کی تحریر ”خاندان اجتہا داور سلطان المدارس“ تاریخی اور معلوماتی ہے۔ بشیر بدر صاحب کو اللہ صحت کاملہ عطا

فرمائے۔ غزلیں اور نظموں کا انتخاب عمدہ ہے۔
محمد عمران قریشی، پرولیا (مغربی بنگال)

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ کا ”رشتائی ادب نمبر“ زیر مطالعہ ہے۔ یہ نمبر آپ کے حسن انتخاب اور ادنی ذوق کی بالیدگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ”گوشہ نثر“ میں مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کا مضمون لکھنؤ کی قدیم



ساتھ کلاسیکل شعرا کا کلام پڑھ کر لطف دو بالا ہو گیا۔ اقتباسات اور مرثیہ کے نمونے بھی خوب ہیں۔ اس خوبصورت اور وسیع شمارہ پر سہیل وحید صاحب اور اسکے معاونین کو دلی مبارک باد۔

عادل فراز، سہارنپور (یوپی)

ماہنامہ نیا دور کے دو شمارے مئی و جوش ۲۰۱۷ء

مطالعہ میں آئے جن میں ذوق ادب رکھنے والے قارئین کے لئے سیرانی ادب کے ادب پارے موجود ہیں۔ نیا دور کارنگ و روپ و تزئین کاری دل کو چھو جانے والی ہے۔ معلوم ہوا کہ کسی فنکار کی صلاحیتوں کا اندازہ اس کے اظہار فن ہی سے لگایا جاسکتا ہے۔ آپ کی ادبی صلاحیتوں کے متعلق صرف سنا تھا، اظہار فن سے لوہا ماننا پڑا۔ دونوں شماروں کی شعری و نثری انتخاب قابل تحسین ہیں۔ کسی ایک پر رائے لکھنا میرے بس کی بات نہیں۔ ادب نئے رجحانات کے تحت ادب برائے ادب بن کر رہ گیا ہے۔ شعری تخلیقات میں صرف غزلیات پر توجہ فرمائی جا رہی ہے اور مشاعروں میں تو غزلیات کا بول بالا ہے۔ نثری تخلیقات کا تو حال اور بھی حیران کن ہے۔ نثر کی ایک صنف افسانہ

اور کہانی ہے جو مشقت طلب ہے۔ آج بھی کئی تخلیق کار شاعری اور نثری تخلیق کا کام ایک ساتھ بخوبی کر رہے ہیں لیکن کئی تخلیق کار نثری تخلیق چھوڑ کر شاعری کی طرف مائل ہو چکے ہیں۔ دو تین شخصیات سے میرا رابطہ ہے جو کہتے ہیں کہ کوئی مضمون یا افسانہ وغیرہ تحریر کرنے میں وقت صرف ہوتا ہے اور مشقت کرنی ہوتی ہے، اتنے وقت میں چار پانچ غزلیں کہی جاسکتی ہیں۔ کہانی

عزاداری کے نقوش کو واضح کرتا ہے اور ذہن عہد نوائین اودھ میں جا بھونچتا ہے جہاں بلا تفریق مذہب و ملت عزاداری برپا کی جاتی تھی۔ مجلس شام غریباں کی تاریخ پر مولانا سید کلب جو ادنیٰ نے معلوماتی مضمون قلم بند کیا ہے۔ ڈاکٹر ظفر انصاری اور شاہد کمال کے مضامین بھی اس شمارہ کی افادیت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ ”گوشہ منظومات“ میں جدید شعرا کے کلام کے

تہذیب و ثقافت کے ایک اہم عنصر 'عزاداری' پر اتنا شاندار شمارہ نکالنے پر ایک بار پھر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔
عمار رضا نقوی، قم (ایران) بذریعہ ای میل

'نیادور' شمارے مئی تا نومبر ۲۰۱۷ء کا سرسری جائزہ لیا۔ بعض کا مطالعہ بھی کیا۔ عرصہ سے میری رسالہ سے دوری ہوئی تھی۔ ان شماروں پر نظر ڈالنے کے بعد

اندازہ ہوا کہ سہیل وحید صاحب رسالہ لہذا کے سلسلہ میں بڑے کشادہ ذہن و قلب کے حامل ہیں۔ اس کا بین ثبوت ان کا عزم مصمم ہے کہ وہ 'نیادور' کو ملک و بیرون ملک تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ وہ لکیر کے فقیر کے قائل نہیں ہیں، ڈھرے بازی سے اجتناب کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے نوع بنوع مضامین و تخلیقات اس رسالہ میں ہمارے سامنے آ رہی ہیں۔ مذکورہ رسائل میں جہاں انہوں نے گمشدہ مصنفین کی بازیافت کی ہے وہیں فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نئے قلم کاروں کو بھی خوش آمدید کہا ہے۔ تعلیم میں تعصب کی گنجائش نہیں ہے۔ اسے کہتے سب ہیں مگر برتنا صرف اکاد کا کوہی آتا ہے۔ اسی لئے ہر جگہ اس کی کار فرمائی ہونے سے ماحول پر اگندہ ہے۔ تفریق کی یکسر ممانعت ہے مگر کیا مجال وقت آنے پر آپ تفریق ہوتے ہوئے نہ دیکھیں اور اسے مصلحت کہہ کر ہونے دیں۔ یہ باتیں قابل غور ہیں اس کے لئے جو کسی منصب پر فائز ہے، مجھے سہیل وحید صاحب کے

یہاں اعتدال و انصاف کا امتزاج نظر آتا ہے۔ اسی لئے یہ رسالہ اب ترقی کے مراحل طے کرے گا۔ ہم ہر شمارے کی تمام تخلیقات کی ستائش کرتے ہیں۔ تفصیل سے گریز کرتے ہوئے مذکورہ سات مہینوں کے تخلیق کاروں کو ان کی عمدہ تخلیقات پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اسرار الحق
لکھنؤ (یوپی)

نصیب ہوا اور دوسرے یہ کہ یہ شمارہ شہر ادب لکھنؤ کے محرم اور عزاداری سے مخصوص ہے اور مجھے لکھنؤ کی تاریخ و تہذیب اور ادب و ثقافت سے ایک گونہ عشق ہے۔ تقریباً گزشتہ پندرہ برس سے 'نیادور' کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ پہلی بار لکھنؤ کے محرم کے حوالے سے 'نیادور' کا کوئی شمارہ منظر عام پر آیا ہے۔ اس کے لئے آپ یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں۔ مشمولات کا انتخاب نہایت عمدہ اور معیاری ہے۔



خاص طور سے نواب جعفر میر عبد اللہ کا مضمون بعنوان 'نشاہی تہذیب عزاداری' کا شہر لکھنؤ بڑا دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ امام جعفر اصفیٰ مسجد مولانا کلب جو ادنیٰ نقوی صاحب کے مضمون سے بھی کئی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ شاہد کمال نے نونے کے موضوع پر اچھی گفتگو کی ہے۔ اس موضوع پر یقیناً کام کرنے کی ضرورت ہے۔ مراشی اور نوحوں کا انتخاب بھی آپ کی خوش ذوقی پر دال ہے۔ آخر میں لکھنوی

یا افسانہ سے آج کل وہ اہم اجزا یا خصوصیات ندراد ہیں جو کہانی یا افسانہ کا حسن بڑھادیتے ہیں اور کسی بھی قاری کو انہیں پڑھنے پر مجبور کردیتے ہیں۔ آپ دانشور ہیں، ان خصوصیات کو جاننے ہیں۔
اختر کاظمی، فتح پور (یوپی)

ماہنامہ 'نیادور' کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ نظم و نثر کا بہترین امتزاج قابل داد و تحسین اور لائق صد آفرین ہے۔ اہل فکر و نظر کا اذعان ہے کہ کربلا نے مختلف اصناف سخن میں اردو و ہندی زبان کو عزت بخشی۔ نوحے، سوز، سلام اور مرثیہ کربلا ہی کی مرہون منت ہے۔ کسی بھی جریدہ کی افادیت صاحبان قلم پر منحصر ہوتی ہے۔ ایسے میں 'نیادور' نے اکتوبر ماہ کے خصوصی شمارے میں ممتاز افراد کے رشحات قلم شائع کر کے 'نیادور' کا معیار قارئین کے لئے از سر نو واضح کر دیا۔ اگر قابل اطلاع ہوتی کہ اکتوبر کا خصوصی شمارہ شہر تہذیب و ادب لکھنؤ کی تہذیب عزاداری اور شان عزاداری کے سلسلہ میں منزل اشاعت سے گزرے گا تو ضرور اس کاروان کا حصہ بنتا۔ امید ہے کہ آئندہ خصوصی شماروں کے لئے ادارہ از قبل مطلع فرمائے گا۔ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے 'نیادور' کی پوری

ٹیم کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ شکر و امتنان کے حروف بے پایاں کے ساتھ۔

سید حیدر عباس رضوی، قم (ایران) بذریعہ ای میل

'نیادور' کا اکتوبر کا شمارہ بیشکل پی ڈی ایف دستیاب ہوا۔ یہ شمارہ میرے لئے دو جہتوں سے خاص رہا۔ ایک تو یہ کہ قریب قریب ایک سال بعد 'نیادور' کا دیدار



اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی سے مل اینڈ ملنڈ انٹیس فاؤنڈیشن کے صدر مسٹر بل گینس نے ملاقات کی (۱۷ نومبر ۲۰۱۷ء)



اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی چک گنجر یا فارم، کھنٹو میں ایچ سی ایل گروپ کے پروگرام کو خطاب کرتے ہوئے (۱۷ نومبر ۲۰۱۷ء)



اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی نے لکھنؤ میں نیدر لینڈ کے سفیر جناب الفونس استولنگا سے ملاقات کی۔ (۱۳ نومبر ۲۰۱۷ء)

उर्दू मासिक
नया दौर
पोस्ट बॉक्स सं० 146,
लखनऊ - 226 001

’नया दौर’ के साल २०१७ के अहम त्खलिक कार



वर्ष : 72 अंक 09
दिसम्बर 2017
मूल्य : 10 रु./-
वार्षिक मूल्य : 110 रु./-

पंजीयन संख्या : 4552 / 51
एल० डब्लू/एन० पी०/101/2006-08
ISSN 0548-0663

प्रकाशक व मुद्रक, अनुज कुमार झा, निवेशक द्वारा सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. के लिए प्रकाश पैकेजर्स, 257 गोलागंज, लखनऊ से
मुद्रित एवं प्रकाशन प्रयाग, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र., सूचना गवना, पार्क रोड, लखनऊ-226001 स प्रकाशित-सम्पादक, सुहेल वहीद